بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

نذرِ عقیدت

بیسویں صدی کے آغاز سے 1930ء تک مسلمانانِ ہند کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ قوم نہیں ایک ناقہ تھی بے زمام' ایک کارواں تھا بے منزل و بے سالار۔ ان کی سعی و عمل' بگولے کے رقص اور سمندر کی لہروں سے زیادہ نتیجہ خیز نہ تھی کہ اس محشرستان تشتت و انتشار میں اللہ کا ایک بندہ اٹھا جسے مبداء فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ ''دانش نورانی'' کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز کیا تھا۔ اس نے قافلہ کے منتشر افراد کو للکارا اور کہا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ قرآن نے تمہاری منزل کونسی متعین کی ہے اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کونسی راہ سیدھی ہے۔ اس نے گردوپیش کے حالات کا تجزیہ کیا اور الہٰ آباد کے مقام پر کھلے اور واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

> شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء علامہ اقبال علیہ الرحمتہ)

پھر اس کی نگاہِ دوررس ایک ایسے صاحبِ فراست و اخلاص کی متلاشی رہی جو ملت اسلامیہ کی اس متاعِ بردہ کی بازیافت کے لئے مقدمہ لڑے اور قوم کو راہ میں فروخت ہی نہ کر دے۔ ۱۹۳۸ء میں اس نے یہ دستاویز ایک ایسے آزمودہ کار' صاحب دیانت و اخلاص' وکیل کے ہاتھوں میں دے دی جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ دنیا نے اسے محمد علی جناح' اور ملت نے قائداعظم کہہ کر پکارا۔

اس نحیف و ناتواں رہبرِ فرزانہ نے جس تدبر و فراست اور اخلاص و دیانت سے اس مقدمہ کو لڑا' دنیا کی عدالتیں اس پر متعجب و حیران ہیں۔ اللہ نے اس کے حسنِ نیت کو متاعِ کامرانی سے نوازا اور اگست ۱۹۴۷ء میں وہ قوم کے حق میں ڈگری لے کر احاطۂ عدالت سے باہر آیا۔

ملتِ اسلامیہ' اس مفکرِ اعظمؒ اور اس قائداعظمؒ کی بارگاہِ عالیہ میں'
حسنِ عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے کا فخر حاصل کرتی ہے۔

ہلالِ عید

غرّۂ شوّال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار! آ! کہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار
اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے! اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے!

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں، تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو اور جو بے آبرو تھے، ان کی خود داری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

صورت آئینہ سب کچھ دیکھ، اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ غلام احمد پرویزؒ

ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

۱۵ دسمبر ۱۹۶۸ء کو بتقریب جشنِ نزول قرآن ۔۔ عید الفطر ۔۔ پرویز صاحب کا خصوصی درس قرآن کریم

آسمان سے رزق

بنیادی طور پر لفظ عید کے معنی ہیں بار بار لوٹ کر آنے والا واقعہ' لیکن اصطلاحاً اس سے مراد ہے وہ جشنِ مسرت جو بار بار آئے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ صرف ایک جگہ آیا ہے' اور وہ ہے وہ مقام جہاں حضرت عیسیٰؑ کے جاں نثار حواریوں نے' آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ خدا سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمارے لئے **''مائدۃ من السماء''** اتارے تاکہ اس سے ہماری جسمانی پرورش کے علاوہ ہمارے قلوب کو بھی اطمینان حاصل ہو۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے خدا سے درخواست کی کہ۔۔ **ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عید لا ولنا واخرنا وایۃ منک۔ وارزقنا۔ وانت خیر الرازقین۔** (۵/۱۱۴۔۱۱۵)۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری نشوونما کا سامان ''آسمان'' سے عطا فرما تاکہ وہ رزق' اس جماعت کے السابقون الاولون کے لئے بھی موجبِ جشنِ مسرت ہو اور ان کے بعد آنے والوں کے لئے بھی۔۔ تو بہترین رزق عطا کرنے والا ہے۔'' سوال یہ ہے کہ یہ **مائدۃ من السماء** آسمان سے اترنے والا رزق۔۔ کیا تھا جس کی درخواست خدا سے کی گئی تھی اور جو ان سب کے لئے باعثِ جشنِ مسرت تھا۔ اعجوبہ پسندوں نے تو حسبِ معمول' اسے بھی ایک چیستان بنا دیا اور کہا کہ حواریوں کے لئے آسمان سے پکے پکائے کھانے کا طشت اترا کرتا تھا حتیٰ کہ اس میں جو کھانے اترتے تھے ان کی تفاصیل تک بھی دینے لگ گئے۔ لیکن جن کی نگاہیں قرآنی حقائق پر ہیں' وہ جانتے ہیں کہ جماعت مومنین جب ''آسمان سے رزق'' طلب کرتی ہے تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے۔ ایک رزق وہ ہے جو انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رو سے ملتا ہے۔ یہ وہ رزق ہے جس سے جسم تو زندہ رہتا ہے لیکن شرفِ انسانیت کی موت واقع ہو جاتی ہے اور دوسرا رزق وہ ہے جس سے جسم انسانی کی نشوونما کے ساتھ' شرف وتکریم انسانیت کی بھی بالیدگی ہوتی ہے۔۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

ایں خدا نانے دہد جانے بُرد
آں خدا نانے دہد جانے دہد

یہی وہ سماوی اقدار کے مطابق ملنے والا رزق تھا جس کے

متعلق حواریوں نے کہا تھا کہ **ان تاکل منھا و تطمئن قلوبنا** ۔ وہ ہمارے لئے وجہ زیست بھی ہو اور باعثِ اطمینان قلب بھی۔ مومن کے لئے باعثِ مسرت وہی رزق ہوسکتا ہے جس سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہو۔۔ اور ظاہر ہے کہ مومن کو اطمینان قلب اسی زندگی میں حاصل ہوسکتا ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق بسر ہو۔۔۔ **الا بذکر اللہ تطمئن القلوب** (۱۳/۲۸)۔ یہی تھا وہ رزق جسے **ایۃ منک** (۵/۱۱۴)۔ کہا گیا تھا۔ یعنی خدا کے نظام ربوبیت کی صداقت کی نشانی اور اس کے خیرالرازقین ہونے کا ثبوت۔۔۔ یہ رزق انہیں ملا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ یاد رکھو۔ **فمن یکفر بعد منکم فانی اعذبہ عذابا لا اعذبہ احدا من العالمین** ۔ (۵/۱۱۵)۔ جو اس نظام رزق سے انکار اور سرکشی کی روش اختیار کرے گا' جو اسے دوسروں سے چھپا کر رکھے گا' اس پر ایسا عذاب وارد ہوگا جس کی مثال کہیں نہیں ملے گی۔

اس کفران کا نتیجہ

یہی وہ عذاب ہے جسے سورۂ نحل میں ایک مثال کے ذریعے یوں سامنے لایا گیا ہے کہ :-

> خدا ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے۔ اس کے رہنے والوں کو امن بھی حاصل تھا اور اطمینان بھی۔ اس کی طرف چاروں طرف سے رزق فراوانیوں سے کھنچے چلا آتا تھا لیکن انہوں نے ان انعامات خداوندی سے کفر برتا اور نظام خداوندی کی جگہ اپنا خود ساختہ نظام اختیار کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ (۱۶/۱۱۲)۔

ایسینی فرقہ

یہ انسانیت کی بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور انکے مقدس ساتھیوں کی اصلی تصویر یا تو ان کے نام لیواؤں کی عقیدت کی شمعوں کے دھوئیں سے ڈھپ چکی ہے اور یا اسے افسانہ طرازیوں کے پردوں میں چھپا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے آ ہی نہیں سکی کہ وہ کیسے عظیم انقلاب کے پیامبر تھے اور انہوں نے کس طرح یہودی پیشوائیت کے خودساختہ نظام ہیکل اور رومیوں کے قصرِ حکومت کی بنیادوں تک کو ہلا دیا تھا۔ اگر ان کی صحیح تاریخ سامنے آجاتی تو معلوم ہو جاتا کہ انہوں نے کس قسم کا آسمانی نظام معیشت قائم کیا تھا جس سے انہیں انسانوں کا مرہون منت ہوئے بغیر' سامان زیست میسر آتا اور ان کے لئے وجہ جشن عید بنتا تھا۔ لیکن وادیٔ قمران سے حال ہی میں جو دستاویزات برآمد ہوئی ہیں ان سے اس جماعت کے احوال وظروف پر خاصی روشنی پڑتی ہے جو اس زمانے میں ایسینی فرقہ کے نام سے معروف تھی اور جو حضرت یحییٰ کے زیر تربیت وقیادت پروان چڑھی تھی۔ خود حضرت عیسیٰؑ بھی' اپنے زمانۂ نبوت سے قبل اسی جماعت سے متعلق تھے۔ اس جماعت کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کوئی شے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ تمام سامانِ زیست مشترکہ استعمال کے لئے کھلا رکھا جاتا تھا۔ کسی کے پاس کوئی شے اس کی ضرورت سے فاضل نہیں ہوتی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کے بعد' آپ کے متبعین کی جو جماعت بیت المقدس میں آکر جمع ہوئی تھی خود اس کے

متعلق بھی، موجودہ انجیل میں لکھا ہے کہ :

وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے۔ (سب مل کر) خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے اور سب لوگوں کو عزیز رکھتے تھے۔

(رسولوں کے اعمال۔ ۲۷۔۲/۲۱)۔

یہ تھا وہ نظامِ رزق جسے انہوں نے مائدۃ من السماء (سماوی اقدار کے مطابق رزق) کہہ کر پکارا تھا اور جس کے ملنے پر جشن عید منایا گیا تھا۔

رسولؐ اللہ کی دعوت کی مخالفت

اور یہ صرف حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کی خصوصیت نہیں تھی۔ خدا کا ہر رسول اسی قسم کا انقلابی نظام قائم کرنے کے لئے آتا تھا جس میں ''تیری اور میری'' کا جھگڑا نہ رہے اور جو کچھ جماعت (یا امت) کے پاس ہو وہ سب کے لئے مشترکہ متاع زیست ہو۔ کیا آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی اس روایت پر غور نہیں کیا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ قبیلہ اشعر کے ہاں یہ دستور تھا کہ جنگ کے زمانے میں، یا ویسے ہی جب ضرورت کا تقاضا ہوتا، قبیلے کے تمام افراد، سارا سامان رزق ایک جگہ جمع کر لیتے اور اس میں سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق لے لیتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس اعتبار سے میں بھی قبیلہ اشعر میں سے ہوں۔ یہی تھا وہ آسمانی انقلاب جسے برپا کرنے کے لئے حضورؐ نے اپنی دعوت کو پیش کیا تھا۔ قریش کے تاجروں، مہاجنوں اور کعبہ کے مجاوروں کی طرف سے جو اس دعوت کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی تھی تو اس لئے نہیں کہ اس میں ایک خدا کو الٰہ تسلیم کرنے کی تعلیم تھی۔ اس سے ان کا کیا بگڑتا تھا؟ یہ مخالفت اس لئے تھی کہ اس میں وحدت خالق کے ایمان کا فطری نتیجہ وحدت انسانیت کا نظریہ تھا۔ اس سے مساوات انسانیہ کا اصول سامنے آتا تھا جس کی رو سے، مختلف افراد میں کسی قسم کی تفریق باقی نہیں رہتی تھی۔ ''اللہ ایک ہے'' کے عقیدہ سے انہیں کسی قسم کی پرخاش نہیں تھی۔ انہیں مخاصمت تھی اس نظریہ سے کہ تمام انسان ایک جیسے ہیں اور ''تمام انسان ایک جیسے ہیں'' کے نظریہ کا اولین عملی نتیجہ یہ تھا کہ سامان زیست میں تمام افراد یکساں طور پر شریک ہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کے سرچشموں پر اس طرح سانپ بن کر بیٹھ جائے کہ دوسرے انسان اپنی روٹی تک کے لئے اس کے دست نگر اور محتاج ہو جائیں۔ ابوجہل نے غلاف کعبہ کو تھام کر اپنے خداؤں سے جو فریاد کی تھی وہ یہی تھی کہ اس نئے دین لانے والے کی قیامت خیزیوں کو دیکھو کہ

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمانؓ مزدکی است

مساواتِ انسانیہ کا اصول

یہ تھا وہ نظام، جسے ہر رسول پیش کرتا تھا اور جس کی مخالفت اس کی قوم کے متمول طبقے کی طرف سے ہوتی تھی۔ قوم

مدین نے حضرت شعیبؑ کی نماز (صلوٰۃ) کے خلاف اعتراض نہیں کیا تھا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ صلوٰۃ' انہیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنا مال بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرسکیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ نظام خداوندی میں صلوٰۃ کا دائرہ کس قدر وسیع ہوتا ہے؟ یہ نظام' دولت پر اپنا کنٹرول اس لئے رکھتا ہے کہ اس سے مساوات انسانیہ قائم رہتی ہے۔ مساوات کے سلسلہ میں آپ غور کیجئے کہ محل میں پیدا ہونے والا اور جھونپڑی میں جنم لینے والا' دونوں' ایک جیسی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ محل میں پیدا ہونے والا بچہ نہ اپنی پیٹھ پر سونے اور چاندی کی تھیلیاں لاد کر لاتا ہے اور نہ ہی اس کے ہاتھ میں کوئی خداوندی دستاویز ہوتی ہے کہ ہم نے اسے اتنے مربعے اراضی یا اتنے کارخانوں کا مالک بنا دیا ہے۔ دونوں بچے خالی ہاتھ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر دونوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی یکساں ہوتی ہیں۔ یعنی جن اشیاء پر ان کی زندگی کا مدار ہے ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہ ہے مساوات انسانیہ کی بنیاد۔ لیکن انسانوں کا خود ساختہ غلط نظام' ان میں تفریق پیدا کر دیتا ہے۔۔ ایسی تفریق کہ ایک انسان کے بچوں کو اتنا بھی میسر نہیں جتنا دوسرے انسان کے کتوں کو ملتا ہے۔ دین خداوندی اس تفریق کو مٹا کر' مساوات انسانیہ قائم کرنے کے لئے آتا ہے اور خدا کا رسول اس نظام کو عملاً متشکل کر کے دکھاتا ہے۔

روٹی کی اہمیت

اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کا مدار صرف ''روٹی'' (بنیادی ضروریات زندگی) پر نہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ارتقائے حیات کی موجودہ سطح پر' انسان کی طبیعی زندگی کا مدار روٹی ہی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظام خداوندی میں روٹی کو اس قدر اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب دنیا میں خدا کے پہلے گھر کی بنیاد رکھتے ہیں۔۔۔ یعنی توحید کا اولین مرکز قائم کرتے ہیں۔۔۔ تو اس کے بعد سب سے پہلی آرزو جو دعا بن کر ان کے لبوں تک آتی ہے' یہی ہے کہ **رب اجعل ھذا بلدا امنا ورزق اھلہ من الثمرات** (۲/۱۲۶)۔ اے میرے نشوونما دینے والے! تو اس بستی کو پرامن بنا دے اور اس کے رہنے والوں کو ہر طرح کا رزق مہیا کر دے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں' رزق فراواں کو خدا کا انعام' اور بھوک کا اس کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ اس نے بنی آدم سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ **من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا**۔۔ جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی۔ **و نحشرہ یوم القیمۃ اعمیٰ**۔ (۲۰/۱۲۴)۔ اور جس کی یہاں روزی تنگ ہوگی اسے قیامت کے دن بھی اندھا اٹھایا جائے گا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق کہا کہ۔۔ **لا تفتح لھم ابواب السماء**۔ (۴۰/۷)۔ ان پر آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ یہی تھا خدائے جلیل کا وہ اعلان عظیم جس کی تشریح میں نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ ''جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا' خدا نے اس بستی سے اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا۔'' یہ کیا ہے؟ وہ عدم مساوات انسانیہ جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا

تھا۔ اگر اس بستی پر کوئی آفت آ گئی تھی (اور ایسا بعض اوقات ہنگامی حالات میں ہو جاتا ہے) تو اس کے تمام باشندوں کو بھوکا رہنا چاہئے تھا لیکن ایسا نظام جس میں بستی کے چند افراد تو پیٹ بھر کر کھالیں لیکن دیگر افراد بھوکے رات کاٹیں' یہ اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے اس بستی پر سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ خدا تو اس نظام کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہے جو اس کے قوانین کے مطابق متشکل ہو۔ وہ نظریہ زندگی' وہ نظام حیات' وہ تہذیب' وہ تمدن کبھی باقی نہیں رہ سکتا جس میں انسان اور انسان میں فرق کیا جائے' جس میں طبقاتی تقسیم ہو۔ فلاح اور بقا اسی نظریہ' اسی نظام' اسی تمدن کے لئے ہے جو بلا تفریق تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں باعث منفعت ہو۔ **ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (۱۳/۱۷)۔

حقیقت یہ ہے کہ بھوکے آدمی کے لئے تمدنی ترقی کا کوئی شعبہ بھی وجۂ کشش اور باعث طمانیت و تسکین نہیں ہوسکتا۔۔ کسی بھوکے آدمی کو جناح باغ لے جا کر بہار کی رنگینیاں اور کیف آفرینیاں دکھائیے' وہ انہیں کبھی (Appreciate) نہیں کر سکے گا۔ اسے بتائیے کہ ملک میں بجلی اس قدر عام ہوگئی ہے کہ گھر گھر قمقمے جل رہے ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھ گیا ہے۔ سر بفلک عمارات کھڑی ہوگئی ہیں۔ بڑے بڑے گرانڈیل کارخانے مصروفِ گردش ہیں۔ فضا میں طیارے پرفشاں ہیں۔ زمین پر موٹریں سبک خرام ہیں۔ وہ یہ سن کر کہے گا کہ یہ سب ٹھیک ہے لیکن۔۔ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی۔۔ بھوک میں بہار کی نزہت آفرینیوں اور بجلی کے قمقموں کی نور افشانیوں سے لطف اندوز ہونا تو ایک طرف' سعدی کے الفاظ میں' بھوکے کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ رات کو نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس سوچ میں غرق ہوتا ہے کہ۔۔ چہ خورد بامداد فرزندم۔۔ صبح میرے بچوں کو روٹی کہاں سے ملے گی۔۔ اس سے بھی آگے بڑھئے جاہلیہ عرب میں قبیلہ بنو حنفیہ نے آٹے کا ایک بت بنا رکھا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ لیکن جب قحط پڑا تو وہ اپنے اس خدا کو بھی کھا گئے۔ اور ایک قبیلہ بنو حنفیہ ہی پر کیا منحصر ہے' ہر بھوکا اس خدا کو کھا جاتا ہے جو اسے روٹی نہیں دیتا۔ روس کے انقلابیوں نے اسی طرح اس خدا کو کھا لیا تھا جس کے متعلق انہیں بتایا گیا تھا کہ ان کی مفلسی اور مفلوک الحالی کا ذمہ دار وہی ہے۔۔ لہٰذا جس شخص کے پیٹ میں روٹی نہیں' جس کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں' جسے سر چھپانے کے لئے چھت میسر نہیں' جس کے پاس دم توڑنے والے بچے کے حلق میں ٹپکانے کے لئے دودھ کے چار قطرے نہیں' اس کے لئے دنیا کی کوئی جاذبیت وجۂ سکون اور باعث دلکشی نہیں ہوسکتی۔ جس شخص کے پاس اپنے بچے کے داخلہ کے لئے پیسے نہیں' اس کے لئے یہ خوش خبری کس طرح وجۂ طمانیت ہوسکتی ہے کہ ملک میں دس ہزار اسکول کھل گئے ہیں اور دو ہزار کالج قائم ہو گئے ہیں۔۔ قوم کی ترقی کا معیار ایک اور فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ اسمیں ہر ایک فرد کو کیا میسر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں چند انسانوں کو کیا کچھ حاصل ہو گیا ہے اور حاصل ہو رہا ہے۔۔ جنت کی تو بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس میں جس قدر سامان آسائش و آرائش ہے' ہر ایک کے لئے یکساں ہے۔ جس جنت میں مساوات انسانیہ نہیں' وہ جنت نہیں جہنم ہے۔

صرف خدا کی ملکیت

لیکن اس قسم کی عملی مساوات انسانیہ تو اسی صورت میں قائم ہوسکتی ہے جب رزق کے سرچشمے خدا کی ملکیت میں رہیں' افراد کی ملکیت میں نہ چلے جائیں۔ جنت کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ اس کی زمین' اس کے چشمے' اس کی نہریں' اس کے باغات' افراد کی ملکیت ہوں گے کہ جس کا جی چاہے اپنے قطعۂ اراضی کو پٹہ پر دیدے اور جس کا جی چاہے' اسے گرو رکھ دے یا فروخت کردے۔ توحید کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ سارے سلسلۂ کائنات کا واحد مالک خدا ہے۔ اگر اس کی ملکیت میں کسی اور کو شامل کرلیا جائے تو یہ شرک ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن **انداداً من دون اللہ** کہہ کر پکارتا ہے (۲/۲۲)۔ جب رزق کے سرچشموں پر انفرادی ملکیت تسلیم کر لی جائے تو جن لوگوں کی اپنی ملکیت نہ ہو' وہ ان مالکوں کے محتاج اور دست نگر ہو جاتے ہیں اور محتاجی کا اگلا قدم ۔۔ یا یوں کہئے کہ فطری نتیجہ ۔۔ محکومی ہے۔ قرآن' اس تصور کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو جب وہ کہتا ہے کہ **ان الذین تعبدون من دون اللہ لا یملکون لکم رزقا**۔ تم خدا کو چھوڑ کر جن کی محکومی اختیار کرتے ہو' جن کے تابع فرمان رہتے ہو' وہ وسائل رزق کے مالک نہیں۔ اس لئے تم **فابتغوا عند اللہ الرزق** ۔۔ رزق' خدا کے ہاں سے طلب کو۔ **واعبدوہ**۔ اس طرح محکومی صرف اسی کی باقی رہ جائے گی۔ **واشکروا لہ** (۱۷/۲۹)۔ اور سپاس گزاری بھی اسی کی زیبا ہوگی۔ تم اپنے غلط نظام معیشت کی وجہ سے' دوسرے انسانوں کو ذرائع رزق کا مالک بنا دیتے ہو۔ پھر تم ان کے محتاج و محکوم بھی ہو جاتے ہو اور رہین منت اور سپاس گزار بھی۔ اس طرح تم اپنی شرف انسانیت کو بیچ کر' اپنے بدن کو زندہ رکھتے ہو۔ قرآن' اس طرح سے حاصل کردہ رزق کو حلال وطیب قرار نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ **فکلوا مما رزقکم اللہ حلالا طیبا۔ واشکروا نعمت اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون۔** (۱۶/۱۱۴)۔ اگر تم انسانوں کی محکومی کے چنگل سے آزاد ہو کر صرف خدا کی محکومی اختیار کرنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم رزق صرف خدا کے ہاں سے حاصل کرو اور اس طرح شکر گزار بھی اسی کے بنو۔ یہی وہ رزق ہے جسے حلال وطیب کہا جائے گا۔ یعنی **ما رزقکم اللہ**۔ وہ رزق جو تمہیں خدا کے ہاں سے ملے جس میں کسی انسان کی ملکیت کا دخل نہ ہو۔ یہی تھا وہ حلال وطیب رزق جس کے لئے حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے درخواست کی تھی اور جس کے حصول کے بعد جشن عید منایا گیا تھا اور یہی تھا وہ رزق طیب جو اس رسولؐ آخرالزمان کے متشکل کردہ نظام کی وساطت سے حاصل ہوا تھا جس کی بعثت عظمیٰ کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ **ویحل لھم الطیبٰت و یحرم علیھم الخبٰئث ویضع عنھم اصرھم والاغلٰل التی کانت علیھم۔** (۷/۱۵۷)۔ وہ نوع انسان کے لئے رزق طیب کو حلال قرار دے گا اور رزق خبیث کو حرام ٹھہرائے گا اور اس طرح ان اغلال وسلاسل کو توڑ دے گا جن میں انسانیت جکڑے چلی آرہی تھی اور محتاجی و محکومی کی استخواں شکن سلوں کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور

فرمایا ہے کہ جو رزق نظام خداوندی کے تابع ملتا ہے' اسے قرآن نے ہر جگہ ''رزق کریم'' کہہ کر کیوں تعبیر کیا ہے؟ اس لئے کہ رزق تو انسانوں کے خود ساختہ نظام کی رو سے بھی مل ہی جاتا ہے' لیکن وہ رزق ملتا ہے عزت اور توقیر بیچ کر۔ لیکن خدا کی طرف سے جو رزق ملتا ہے اس میں تکریم و احترام انسانیت بھی باقی رہتی ہے۔ اسی لئے یہ رزق ''رزق کریم'' ہوتا ہے۔

انسانیت کش نظام

دین خداوندی کا مقصد ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جس میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشو ونما پا کر پروان چڑھ جائیں اور اس طرح وہ زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ یہ صلاحیتیں اسی صورت میں برومند ہوسکتی ہیں جب وہ سامان زیست کے لئے کسی انسان کا دست نگر نہ ہو۔ رزق کو اپنے ہاتھ میں لے لینے والی قوتیں اتنا ہی نہیں کرتیں کہ وہ لوگوں کو مفلس اور محتاج بنا دیتی ہیں۔ وہ ان کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتیں۔ اس لئے کہ انہیں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے تابع فرمان کام کرنے والوں کی صلاحیتیں نشو ونما پا گئیں تو وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جائیں گے اور انہیں حیوانات کی طرح دبا کر رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا' ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ صرف حیوانی سطح پر زندہ رہیں' انسانی سطح پر کبھی نہ آ سکیں۔ آپ سوچئے کہ جب انسانوں کی اکثریت کو اس طرح ابھرنے اور آگے بڑھنے سے روک دیا جائے تو یہ چیز ارتقائے انسانیت کے راستے میں کس قدر سنگ گراں بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اکتناز دولت کرنے والے سرمایہ داروں اور ان کے شریک کار مذہبی پیشواؤں کے متعلق کہا ہے کہ وہ کاروان انسانیت کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہیں خدا کی طرف جانے ہی نہیں دیتے۔ **و یصدون عن سبیل اللہ۔** (۹/۳۴)۔

رسول کے بعد

قرآن بتاتا ہے (اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ) خدا کا رسول اس قسم کا انقلابی نظام متشکل کر کے چلا جاتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد' مفاد پرست گروہ پھر سے سر نکالتا اور اس نظام کو الٹنے کی کوشش کرتا لیکن وہ تنہا ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملاتا۔ یہ مذہبی پیشوا اس سلسلہ میں کیا ٹیکنیک اختیار کرتے' اسے قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کے ضمن میں بڑے بصیرت افروز انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے معاشرہ کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ انکے ہاں کے بڑے بڑے لوگ (جو دولت اور قوت کے مالک بن بیٹھے تھے) کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے اور جب انہیں دشمن پکڑ کر لے جاتا تو پھر چندہ اکٹھا کرتے تاکہ ان کا فدیہ دے کر انہیں دشمن کی قید سے آزاد کرا لیا جائے۔ وہ (انہیں اس طرح آزاد کرانے کو) بڑا ثواب کا کام سمجھتے۔ اگر مذہب پرستی کی سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ کام واقعی بڑے ثواب کا نظر آئے گا۔۔۔ خود قرآن کریم میں' اسیروں اور غلاموں کو آزاد کرانے کے کام کو بڑا مستحسن قرار دیا گیا ہے۔۔ لیکن قرآن اس قسم کے نظر فریب سطحی جذبات سے بلند ہو کر حقائق کو سامنے

لاتا ہے۔اس نے اس مقام پر کہا کہ اس طرح قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو ثواب کا کام سمجھنے والو! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ **ھو محرم علیکم اخراجھم** ۔ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرنا' ایسا سنگین جرم تھا جس کی تلافی اس قسم کے خیرات کے کاموں سے نہیں ہوسکتی۔ تمہیں جو ضابطۂ ہدایت دیا گیا تھا اس میں دو احکام تھے۔۔ ایک یہ کہ اپنے ہاں کبھی ایسی صورت پیدا نہ کرو کہ تم میں سے کمزور لوگوں کو دشمن اچک کر لے جائیں اور دوسرے یہ کہ جن کمزور و ناتواں لوگوں کو مستبد قوتیں قیدی بنا لیں انہیں فدیہ دے کر چھڑا دیا کرو۔ یہ بڑا نیکی کا کام ہے۔تم نے پہلے حکم کو نہ صرف پس پشت ڈال دیا بلکہ عمداً اس کی خلاف ورزی کی اور دوسرے حکم کی تعمیل سے اپنے آپ کو بڑا نیکوکار سمجھنے لگ گئے۔ یہ روش غلط ہے۔ ضابطہ خداوندی کو بتمامہٖ لیا جائے گا تو اس کا نتیجہ خوشگوار مرتب ہو گا۔ لیکن اگر ایسا کیا جائے کہ **افتؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض** ۔اس کے ایک حصہ پر ایمان رکھا جائے اور دوسرے حصہ سے انکار کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نہیں برآمد ہوگا کہ تمہیں پچاس فیصد نمبر مل جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **خزی فی الحیوٰۃ الدنیا و یوم القیمٰۃ یردون الیٰ اشد العذاب** (۲/۸۵)۔تم دنیاوی زندگی میں بھی ذلیل وخوار ہو گے اور قیامت کے دن بھی سخت ترین عذاب میں گرفتار۔

مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ نظام خداوندی کے اس حصہ کو جس سے مفاد پرستوں کی منفعت کوشیوں پر زد پڑتی ہو' پس پشت ڈال دیتی ہے اور ظواہر و رسوم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دیتی ہے کہ وہ عین دین بن جاتی ہیں۔ یہ ہے ان کی وہ ٹیکنیک جس سے وہ قوم کو اس فریب میں مبتلا رکھتے ہیں کہ وہ دین خداوندی پر عامل ہے۔

جس طرح سابقہ امتوں کے احبار و رہبان نے یہ چال چلی تھی' اسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ان کے ہاں بھی دین کی اصل و اساس کو پس پشت ڈال دیا گیا اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کو بڑھا بڑھا کر عین دین بنا دیا گیا۔اب سارا زور ان جزئیات کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ دین کی اصل و بنیاد کو سامنے نہ آنے دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے کچھ روایات اور حکایات وضع کی جاتی ہیں جنہیں کبھی حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات گرامی کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور کبھی سلف صالحین کی طرف۔ چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔

(۱) قرآن کریم میں ہے:-

دولت جمع کرنے کے خلاف

اے ایمان والو! یاد رکھو۔ان علماء و مشائخ کی اکثریت ایسی ہے جو لوگوں کے مال کو ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور اس طرح انہیں خدا کے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔

(اور اسے بھی یاد رکھو کہ) جو لوگ دولت جمع کرتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی منفعت کے لئے (فی سبیل اللہ) کھلا نہیں رکھتے' ان کے لئے الم انگیز عذاب ہے۔جس دن چاندی سونے کے ان سکوں کو

جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کی پیشانیوں' ان کے پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے جمع کر رکھا تھا۔ اب اس اکتناز کا مزہ چکھو۔ (۳۵۔۳۴/۹)

ان آیات سے روز روشن کی طرح واضح ہے (اور قرآن میں اس مضمون کی یہی دو آیات نہیں۔ اس قسم کی متعدد آیات ہیں) کہ اسلام ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہتا ہے جس میں دولت جمع نہیں کی جا سکتی۔ اب دیکھئے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے خلاف کیا کیا۔ اس نے ایک روایت وضع کی جو غور سے سننے کے قابل ہے۔ وہ روایت یہ ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جب (مندرجہ بالا) آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گذری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ الخ

(ابوداؤد۔ بحوالہ مشکوٰۃ۔ جلد اول۔ اردو ترجمہ ص ۳۰۹)

آپ غور فرمائیے کہ اس ایک روایت نے کس طرح اسلام کے پورے کے پورے معاشی نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔ اس روایت سے (جو ظاہر ہے کہ وضعی ہے) یہ ثابت ہوا کہ۔

(۱) صحابہؓ سب کے سب سرمایہ دار تھے اور دولت جمع کرنا ان کا شعار تھا۔

(۲) صحابہؓ کی (معاذ اللہ) کیفیت یہ تھی کہ خدا ایک حکم نازل کرتا ہے۔ اس کا رسول اس حکم کو ان تک پہنچاتا ہے۔ لیکن وہ حکم ان پر سخت گراں گزرتا ہے۔ وہ اسے بدلوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے (معاذ اللہ) ان سرمایہ پرستوں کا سب سے بڑا نمائندہ حضرت عمرؓ رسولؐ اللہ کے پاس جاتا ہے۔

(۳) رسولؐ اللہ (معاذ اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ تم خدا کے اس حکم کا کچھ خیال نہ کرو۔ تم جتنی جی چاہے دولت جمع کرتے جاؤ۔ بس اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ نکال دیا کرو۔ باقی دولت سب پاک ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا حکم بھی قرآن میں کہیں نہیں)۔

آپ دیکھیں گے کہ اس اڑھائی فیصد زکوٰۃ کی اہمیت اور افضلیت پر اس قدر زور دیا جائے گا اور قرآن کی اس آیت کے متعلق (جس میں دولت جمع کرنے کے خلاف اس قدر تہدید آئی ہے) ایک لفظ بھی نہیں کہا جائے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ٹیکنیک سے مسلمانوں کو کس طرح اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ دولت جمع کرنا کوئی جرم نہیں اور زکوٰۃ دیدینے سے سب مال پاک ہو جاتا ہے!

عبوری دور کے احکام

ایک مثال اور لیجئے۔ قرآن کریم کا نصب العین

ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل تھا جس میں کوئی شخص کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی' بطور بنیادی حق انسانیت ملتی رہیں۔ آغاز اسلام کے وقت معاشرہ جس حالت میں تھا اس نے' اپنے پروگرام کو وہاں سے شروع کر کے' بتدریج اس کے منتہیٰ تک لے جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت معاشرہ میں طبقاتی تفاوت موجود تھا۔ کچھ لوگ امیر تھے' کچھ غریب اور محتاج۔۔ اس عبوری دور کے لئے قرآن نے دولت مندوں کو تلقین و تاکید کی کہ وہ صدقہ و خیرات سے محتاجوں کی مدد کریں۔ وراثت کے احکام بھی بنیادی طور پر اسی دور سے متعلق تھے۔ اس نظام کی آخری شکل یہ تھی جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ **یسئلونک ماذا ینفقون۔ قل العفو۔** (۲/۲۱۹)۔ اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر مال دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی بنیادی ضروریات سے زائد ہے' سب کا سب۔ یہ نظام ایسا تھا جس میں ہر ایک کی ضروریات نظام مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں اور کسی کے پاس فالتو روپیہ رہتا ہی نہیں تھا۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مذہبی پیشوائیت نے اس کے بعد کیا کیا؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے صدقہ' خیرات' فطرانہ کے لئے صبح و شام' دن رات' ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے اور قرآن کی وہ آیت جس میں حکم دیا گیا تھا کہ فالتو دولت کسی فرد کے پاس نہ رہنے پائے' کبھی سامنے نہیں لائی جاتی! جب اس پر زور دیجئے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ آیت' زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہو چکی ہے۔ (بحوالہ روایت حضرت ابن عباسؓ)

صدقہ و خیرات کا نتیجہ

اور آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ صدقہ اور خیرات کا عملی مفہوم کیا ہے؟ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ نظام معاشرہ ایسا قائم کیا جائے جس میں ایک طبقہ ہمیشہ اپنی ضروریات زندگی سے محروم' فلہٰذا' دوسروں کا محتاج رہے اور دوسرا طبقہ ایسا ہو جسکے پاس اپنی ضروریات سے زائد دولت ہو۔ یہ دوسرا طبقہ' پہلے طبقہ کو خیرات دے کر ثواب کمائے۔ آپ سوچئے کہ اس دوسرے طبقہ کے پاس یہ فالتو روپیہ آیا کہاں سے ہے؟ بادنیٰ تدبر یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ یہ روپیہ انہی لوگوں کی محنت کی کمائی ہے' جو معاشرہ میں محتاج بن چکے ہیں۔ اگر ان لوگوں کو ان کی محنت کا پورا پورا ماحصل دے دیا جاتا تو نہ وہ محتاج ہوتے' نہ ان کے پاس فالتو روپیہ آتا۔ لیکن اس نظام نے کیا یہ کہ پہلے ایک طبقہ نے محنت کشوں کی کمائی کو غصب کیا اور اس طرح خود دولت مند بن گیا اور محنت کشوں کو محتاج بنا دیا۔ اور پھر ان محتاجوں کو خیرات کے چند ٹکے دے کر' جنت کا مالک بن بیٹھا۔ حالانکہ' قرآن کے الفاظ میں' ان لوگوں کو محتاج بنانا ایسا سنگین جرم ہے جس کی تلافی صدقہ' اور خیرات سے ہو ہی نہیں سکتی۔ خیرات دینے والے کا نفس موٹا ہو جاتا ہے اور لینے والے کے شرفِ انسانیت کی سخت تذلیل ہوتی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق۔

الصدقة نميت القلب

خیرات سے انسان کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم نے عبوری دور کے لئے (اسلامی نظام کی تشکیل

کے زمانے تک بہ تقاضائے حالات) اسے روا رکھا تھا۔ اور اس میں بھی دینے والوں سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اس جذبہ کے ماتحت دیں کہ **لا نرید منکم جزاء ولا شکورا** (۹/۷۶)۔ ہم تم سے کسی معاوضہ کے متمنی ہیں نہ شکریہ کے خواہاں۔ اور اس کی تاکید کر دی تھی کہ وہ محتاج کی امداد کے بعد اسے احسان جتا کر اپنے صدقات کو باطل نہ بنا دیں لیکن موجودہ مذہب نے صدقہ و خیرات کو مستقل کار ثواب قرار دے کر' قوم میں محتاجوں اور مفلسوں کے گروہ کی موجودگی کو مستقلاً ضروری قرار دے دیا تاکہ ثواب دارین حاصل کیا جائے۔ کیا یہ وہی بنی اسرائیل کی روش نہیں جس سے وہ پہلے اپنے ہم نفسوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے اور پھر فدیہ دے کر انہیں چھڑانے کو بہت بڑی نیکی کا کام تصور کرتے تھے؟ یاد رکھئے! جس نظام معاشرہ میں محتاج اور مفلس مستقلاً موجود رہیں اس سے زیادہ انسانیت سوز نظام کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

نظامِ ربوٰ

ایک مثال اور سامنے لائیے۔ قرآنی تصور معیشت کی رو سے' کوئی شخص جو کسی دوسرے کی محنت کے ماحصل کو کلیتہً یا جزء ہتیا کر لے جائے' وہ چور ہے' ڈاکو ہے' رہزن ہے' فریب کار ہے۔ قرآن ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں کوئی کسی کی محنت کو غصب کر کے نہیں لے جا سکتا۔ اس کی بالکل ضد ایک اور نظام معیشت ہے جس میں ایک شخص محض سرمایہ کے زور پر دوسروں کی محنت کو غصب کر لیتا ہے۔ وہ اسے ربوٰ کے نظام سے تعبیر کرتا ہے۔۔ ربوٰ کے معنی ہیں بڑھوتری۔ یعنی اپنے سرمایہ سے زیادہ وصول کرنا۔ یہ نظام اس قدر قرآنی نظام کی ضد اور اس کا دشمن ہے کہ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں **فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہٖ** (۲/۲۷۹)۔ انہیں خدا اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم دے دو۔ آپ نے غور کیا کہ اسلامی نظام کی رو سے ربوٰ کیسا سنگین ترین جرم ہے۔ یہ بغاوت کے مرادف ہے۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے کیا کیا۔ وہ ربوٰ کو جائز تو قرار نہیں دے سکتی تھی لیکن اس نے ربوٰ کی تعریف (Definition) ایسی کر دی جس میں دوسروں کی محنت کا غصب کر کے لے جانا شیر مادر کی طرح حلال و طیب قرار پا گیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر ایک شخص کسی کو کچھ روپیہ قرض دے تو اس اصل زر سے کچھ زیادہ وصول کرنا ربوٰ ہے اور بس۔ یعنی زمیندار کا' کاشتکار کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیدا کردہ فصل کا آدھا سمیٹ لینا ربوٰ نہیں۔ صاحب جائداد کا مکانوں کا کرایہ وصول کرنا ربوٰ نہیں۔ ایک کارخانہ دار کا ہزارہا مزدوروں کی محنت کے ماحصل میں سے انہیں تین چار روپیہ روزانہ دے کر باقی سارا غصب کر لینا ربوٰ نہیں۔ دکاندار کا' کاریگر کو کم از کم اجرت دے کر' باقی سارا منافع ہڑپ کر جانا' ربوٰ نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ مذہبی پیشوائیت نے ربوٰ کی غلط (Definition) سے' (ایک مختصر سی شکل کو چھوڑ کر) ربوٰ کے سارے کاروبار کو کس طرح حلال و طیب قرار دے دیا۔

تجارت کا منافع

اسی سلسلہ میں' ایک قدم اور آگے بڑھئے۔ قرآن

کریم نے لاگت پر کچھ زیادہ وصول کر لینے کو تجارت قرار دے کر' اس منافع کو جائز قرار دیا تھا۔ یہ درحقیقت' اس چیز کے فروخت کرنے والے کی محنت کا معاوضہ تھا۔ قدیم زمانہ میں تجارت جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا۔ جو قافلہ ترکستان سے سامان لاد کر' پہاڑوں' دریاؤں' صحراؤں' جنگلوں' پرخطر راستوں' برفانی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا' مہینوں کے بعد ہندوستان پہنچتا تھا' وہ جو کچھ اپنے مال پر زائد وصول کرتا تھا' وہ اس کی محنت کا معاوضہ تھا۔ اسے قرآن نے ربٰو کی حد سے خارج قرار دیا تھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ ایک شخص' ایک کمرہ میں میز کے سامنے بیٹھا ٹیلیفون پر سودے پر سودے کرتا چلا جاتا ہے۔ نہ حقیقتاً کچھ خریدتا ہے نہ بیچتا اور اس طرح شام کو ہزاروں روپے اس کے بینک میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسے تجارت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہزاروں روپے کہاں سے آتے ہیں؟ ان اشیاء کے صارفین کی جیب سے۔ کیا یہ صارفین کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو غصب کر لینے کے مرادف' فلہٰذا ربٰو نہیں؟ لیکن مذہبی پیشوائیت کا نظام اسے ربٰو قرار نہیں دیتا۔۔ وہ' دوسروں کی محنت غصب کر لینے کے ان تمام طریقوں کو حلال و طیب قرار دیتا ہے اور اس سے جب محنت کش یا صارفین غریب ہو جاتے ہیں' تو ان زمینداروں' کارخانہ داروں' اور اس قسم کے منافع خور سوداگروں سے اپیل کرتا ہے کہ ان غریبوں کو خدا واسطے کچھ دے کر' اپنا گھر جنت میں الاٹ کرالیں یا حج کر کے اپنے سب گناہ بخشوالیں۔ حالانکہ **وھو محرم علیکم اخراجھم**۔۔ ان محنت کشوں کی محنت کو غصب کر کے اپنی تجوریاں بھرتے چلے جانا ایسا سنگین جرم تھا جسے خدا اور رسولؐ کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا تھا۔۔ غلط نظام کی عدالت' چور' ڈاکو' رہزن کو مجرم قرار دے کر مستوجب سزا ٹھہرائے گی لیکن اس قسم کے رہزنوں' اور قزاقوں کو کسی جرم کا مرتکب قرار نہیں دے گی۔ علمائے کرام' روپیہ کا سودی کاروبار کرنے والے کو جہنم کا کندہ بنائیں گے' لیکن ربٰو کی ان دوسری شکلوں میں' سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنے والوں کو پکے اور سچے مومن قرار دیں گے۔۔ ہے ناں یہ **تؤمنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض** کی بین مثال!

بھوکے کا جرم

اسکے برعکس' اگر کسی مزدور کو مسلسل کوشش کے باوجود روزگار نہ ملے اور بھوک سے تنگ آ کر کہیں سے روٹی چرا لے تو قانون اسے جیل خانے بھیج دیتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ بھی ہماری تاریخ میں موجود ہے کہ جب ایک شخص کے ملازموں (غلاموں) نے بھوک سے تنگ آ کر غلہ چرایا تھا' تو حضرت عمرؓ نے انہیں سزا نہیں دی تھی۔ سزا ان کے مالک کو دی تھی' یہ کہہ کر کہ اگر تم انہیں بھوکا نہ رکھتے تو یہ چوری کرنے پر مجبور کیوں ہوتے۔ حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ درحقیقت قرآن کریم کے اس نظریہ پر مبنی ہے کہ اضطراری حالت میں بقدر ضرورت حرام شے کا کھا لینا بھی جائز ہے۔ امام ابن حزم نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

> فقہا کا قول ہے کہ اگر کوئی شخص پیاسا ہے اور اس کی وجہ سے اسے موت کا خطرہ لاحق ہو رہا ہے تو اس کے لئے فرض ہو جاتا ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی پانی پائے'

لے لے۔خواہ اس کے لئے اسے جنگ تک بھی کیوں نہ کرنی پڑے۔

اس پر اضافہ کرتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں کہ :

اگر پیاس کی وجہ سے موت کی مدافعت کے لئے پانی حاصل کرنے کی خاطر جنگ کرنے کی اجازت ہے تو کیا وجہ ہے کہ بھوک اور عریانی کی وجہ سے حفاظت جان کے لئے جنگ کرنے کی اجازت نہ ہو۔ ان دونوں میں فرق کرنا قرآن' سنت' اجماع اور فقہی قانون قیاس کے خلاف ہے۔

اس کے بعد امام ابن حزم کہتے ہیں کہ :

اگر اس مقابلہ میں یہ مجبور شخص مارا جائے تو فریق مخالف کے ذمے اس کی دیت لازم آ جائے گی۔لیکن اگر وہ شخص مارا جائے جو اس کے حق کو روک رہا تھا تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ کیونکہ اس نے اس کا حق روکا تھا۔(المحلیٰ۔جلد نمبر ٦)

معاشرہ میں اس قسم کی صورت حالات کے پیدا ہونے کو روکنے کے لئے حضور نبی اکرمؐ نے وہ نسخہ تجویز فرمایا تھا جسے آپ نے تمثیلی انداز میں یوں بیان فرمایا تھا کہ

کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ان میں سے کچھ اوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصے میں رہے جو نچلے حصے میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اوپر گئے تو اوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا۔ ہم نیچے سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔اب اگر ان نیچے والوں کو پانی دے کر اس سے روکا نہ جائے تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔(ترمذی۔۔ باب الفتن)

آپ دیکھئے' کہ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر اوپر والے پانی نہیں دیتے تو نیچے والوں کو چاہئے کہ صبر شکر کر کے بیٹھ جائیں اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔حضورؐ ایسا فرما ہی نہیں سکتے تھے کوئی ایسا شخص اس قسم کی بات نہیں کہے گا جسے معلوم ہو کہ جان کی حفاظت' ہر جاندار کی زندگی کا بنیادی تقاضا ہے۔اس تقاضا کو روکا نہیں جا سکتا۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ حقائق سے چشم پوشی کرتا ہے۔اسی تقاضا کا اعتراف تھا جس کے لئے خدا نے بھوک سے مجبور و مضطر کے لئے حرام کھا لینے کی اجازت دی تھی۔قرآن کریم کے اسی حقیقت بدوش فیصلہ کی تعمیل تھی جس کے پیش نظر حضرت عمرؓ نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والوں کو سزا نہیں دی تھی۔اسی قرآنی فیصلہ کی عملی تشریح تھی جس کے لئے امام ابن حزم نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ بھوکے' پیاسے' ننگے کو ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے جنگ تک بھی کرنی پڑے تو اسے معذور سمجھا جائے گا۔۔۔اور اسی صورت حال کو روکنے کے لئے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ کشتی اسی صورت میں سلامت رہ سکتی ہے جب تمام اہل کشتی کو ضرورت کے مطابق پانی ملتا رہے۔

یہ تھا خدا کا فیصلہ اور یہ تھی اس فیصلے کی عملی تشریح جو اس کے رسولؐ نے بیان فرمائی۔لیکن اب یہ فیصلہ سمٹ سمٹا کر

صرف اتنا رہ گیا کہ بھوکے کے لئے' اضطراری حالت میں سؤر کا گوشت کھانا جائز ہے۔۔ یعنی جس بھوکے کے پاس روٹی کھانے کے لئے چار آنے کے پیسے نہیں' وہ کہیں سے تلاش کر کے' دس روپے کا لحم خنزیر حاصل کرے تو اس سے اپنی بھوک مٹا سکتا ہے۔۔ آپ نے دیکھا کہ اس فتویٰ کی رو سے کس طرح قرآن کا حکم بھی (بظاہر) اپنے مقام پر باقی رہا اور ''کشتی'' کے اوپر کے حصے والے'' بھی دندناتے پھرتے رہے! لیکن اس قسم کی خود فریبی یا ابلہ فریبی سے حضورؐ کے ارشاد کے مطابق' کشتی تو سلامت نہیں رہ سکتی۔

ظواہر پرستی

دین کے نظام میں' نماز' روزہ' حج وغیرہ وہ ذرائع تھے جن سے دین کا مقصود حاصل ہونا تھا۔ یعنی مساواتِ انسانیہ اور احترامِ آدمیت کا مقصدِ عظیم۔ لیکن مذہب میں یہی چیزیں مقصود بالذات بن گئیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اب زور نماز' روزہ وغیرہ کی ظاہر اور رسمی ہیئت کی اہمیت پر دیا جاتا ہے اور اس مقصد کو سامنے لایا ہی نہیں جاتا جس کے حصول کا یہ ذریعہ تھے۔ اس کے برعکس' قرآن کو دیکھئے تو وہ سارا زور مقصد پر دیتا ہے۔ غور سے سنئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

> نیکی اور کشاد کی راہ یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی کی راہ اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر' اس کے قانون مکافات عمل کے لئے حیات آخرت پر' ملائکہ پر' ضابطہ خداوندی پر اور ان انبیاء پر جن کی وساطت سے یہ ضوابط خداوندی دنیا کو ملے۔ ان امور پر ایمان لائے اور پھر مال کی محبت کے باوجود اسے ان لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے جو اس کے قرب و جوار میں (یا رشتہ داروں میں) محتاج ہوں۔ جو معاشرہ میں تنہا رہ گئے ہوں۔ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو' یا ان میں کام کرنے کی استطاعت نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جن کے پاس زادِ راہ نہ رہے' یا وہ جن کی کمائی ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی نہ ہو۔ یا جو لوگ دوسروں کی محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوں۔ انہیں آزاد کرانے کے لئے اپنی فاضلہ دولت کو وقف کر دیں۔ نیکی کی راہ ان لوگوں کی ہے۔۔ الخ (۲/۱۷۷)۔

ایمان کی اہمیت

اس مقام پر میں' ایک ثانیہ کے لئے رک کر' ایک اہم نکتہ کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس آیہ جلیلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اصل نیکی کا کام یہ ہے کہ تم دوسروں کی مدد کے لئے اپنا مال کھلا رکھو۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اہم شرط بھی عائد کر دی ہے اور وہ یہ کہ تم دین کے ان اساسی عناصر پر ایمان لاؤ۔ سوال یہ ہے کہ ایمان کی کیا اہمیت ہے اور اس کے بغیر خود مال کا دینا بھی نیکی کا کام کیوں نہیں قرار پاتا۔ ایمان' درحقیقت وہ آئیڈیالوجی' وہ نظریہ' ہے جو زندگی کا صحیح تصور عطا' اور اس کا نصب العین متعین کرتا ہے۔ یہ آئیڈیالوجی ہی ہے جس کی بنیادوں پر اعمال انسانی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہی' کسی کام کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار

بنتی ہے۔ اسی کے مطابق انسانی اعمال اپنے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ انسانی عمل کا جذبہ محرکہ ہی اس کا ایمان (آئیڈیالوجی) ہوتا ہے۔ اور یہی اس کے لئے صحیح اقدار حیات متعین کرتا ہے۔ اقدار (Values) نہ ہوں تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق ہی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب زندگی کو محض آب وگل کا کھیل سمجھا جائے اور موت کو اس کا انجام' تو انسانی زندگی' حیوانی سطح سے بلند نہیں ہوتی۔ یہ صحیح آئیڈیالوجی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے اشتراکیت جیسا معاشی نظام' جو سرمایہ داری کے مقابلہ میں کہیں انسانیت ساز ثابت ہوسکتا تھا' پروان نہیں چڑھ رہا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن' ایمان (آئیڈیالوجی یا صحیح نظریہ حیات) کو اپنے معاشی نظام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو اقتدار یا نظام' نظریۂ حیات یا اقدار کے بجائے اشخاص سے وابستہ ہو' اس کی عمر' شخص متعلقہ کی عمر سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نظریہ پر مبنی نظام' اشخاص کا محتاج نہیں ہوتا۔ جب تک وہ اقدار قائم رہیں وہ نظام بھی قائم رہتا ہے۔ یہی وہ عظیم اصولی حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لئے کھلے الفاظ میں کہہ دیا گیا کہ۔۔ **وما محمد الا رسول۔ قد خلت من قبله الرسل۔ افان مات او قتل انقلبتم علے اعقابکم۔** (۳/۱۴۴)۔ یعنی' اور تو اور' خود محمدؐ بھی بجز ایں نیست کہ اللہ کے ایک پیغمبر ہیں۔ ان سے پہلے بھی خدا کے پیغامبر آتے رہے اور اپنی عمر پوری کرنے کے بعد دنیا سے چلے جاتے رہے۔ تو کیا اگر کل کو یہ بھی قتل کر دیئے جائیں' یا وفات پا جائیں' تو تم یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام صرف ان کی ذات سے وابستہ تھا' پھر اپنے نظام کہن کی طرف لوٹ جاؤ گے؟ اور اس کی تشریح خلفیہ رسول' حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس طرح فرمائی کہ جب رسولؐ اللہ کی وفات پر امت میں کہرام مچ گیا تو آپ نے حاضرین کو مخاطب کیا اور ان سے کہا کہ اس بات کو غور سے سن لو کہ جس شخص نے محمدؐ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی وہ سمجھ لے کہ اس کا معبود مر گیا ہے۔ لیکن جو خدا کا عبد تھا اسے اطمینان رکھنا چاہئے کہ اس کا معبود حی و قیوم ہے۔ وہ کبھی نہیں مرے گا۔ اس اعلان عظیم نے دین کے نظام کو شخصیتوں سے بلند لیجا کر اقدار و نظریات کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ نظام اس وقت بگڑا جب مسلمانوں نے قرآنی نظریۂ زندگی کو چھوڑ کر غیر قرآنی نظریات و تصورات کو اختیار کر لیا' اور سارا زور شخصیتوں پر دینے لگ گئے یا شخصیتیں سارا زور اپنے آپ کو منوانے پر صرف کرنے لگ گئیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا ارفع و اعلیٰ نظریہ پیش کیا تھا اور اس نظریہ کے مطابق حضور نبی اکرمؐ نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی تھی جو رنگ' نسل' زبان' وطن کی نسبتوں سے بلند ہو کر' ایک عالمگیر وحدت بن گئی تھی۔ اس باب میں' میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر وحدت امت اس صورت میں وجود پذیر ہوسکتی ہے جب اس آئیڈیالوجی کی نمود ہماری عملی زندگی میں ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو اور آئیڈیالوجی محض الفاظ کا مجموعہ بن کر رہ جائے جسے رسمی طور پر دہرا لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس سے وحدت امت

کبھی ظہور میں نہیں آ سکتی' ایسا کرنے والے افراد کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے۔ آپ سوچئے کہ اس وقت دنیا میں ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں جو زبانی اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا خدا ایک' رسول ایک' قبلہ ایک' کلمہ ایک ہے۔ اس اقرار کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لاشعوری طور پر اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ سب مسلمان ۔۔ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخد کاشغر۔۔ ایک قوم کے افراد ہیں۔ لیکن عملاً ہماری صورت یہ ہے کہ ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان تو ایک طرف' ایک ملک کے مسلمان باشندے بھی ایک قوم کے افراد نہیں۔ اس خود فریبی کا سخت مضرت رساں پہلو یہ ہے کہ' ہم آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک قوم تو بنتے نہیں' اور دنیا نے آئیڈیالوجی سے الگ ہٹ کر' تشکیل قومیت کے جو عناصر تجویز کئے ہیں' ۔۔ مثلاً نسل' یا وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل ۔۔ انہیں' نہ صرف یہ کہ ہم اپناتے نہیں بلکہ انہیں خلاف اسلام قرار دے کر مسترد کر دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر' اسلام کو ہم اپنی عملی زندگی میں رائج نہیں کرتے اور کفر کو ہم اپناتے نہیں۔ یعنی ہم نہ آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک قوم بنتے ہیں (جو قرآن کا تقاضا تھا) اور نہ ہی باقی اقوام عالم کے معیاروں کے مطابق ایک قوم بنتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا میں مسلمان جہاں کہیں بھی ہیں' انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قومی اور اجتماعی نہیں۔ اس کا مشاہدہ آپ خود پاکستان میں کر سکتے ہیں۔ ہم اب بھی قوم نہیں بن سکے' انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے سامنے اپنا اپنا انفرادی مفاد ہے۔ اجتماعی مفاد کسی کے پیش نظر نہیں۔ یہ ہوتا ہے حشر اس قوم کا جو آئیڈیالوجی کے الفاظ کو دہرا کر اس فریب نفس میں مبتلا ہو جائے کہ یہ اپنے نتائج عملاً مرتب کر دے گی۔

☆☆☆☆

اب پھر اسی مقام کی طرف آیئے جہاں سے میں نے اس سلسلے کو چھوڑا تھا۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ' قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ نیکی اور سعادت کی راہ' ارکان اسلامی کی رسمی پابندی نہیں۔ نیکی اور کشاد کی راہ اس کی ہے جو دین کے مقصود و منتہیٰ پر نگاہ رکھے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے دوسرے مقام پر کہا ہے۔

> کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کے مختلف کام سرانجام دے دینے سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو خدا اور حیات آخرت پر ایمان رکھے اور خدا کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرے۔ (تم اپنے خود تراشیدہ تصور مذہب کی رو سے کچھ ہی سمجھ لو) میزان خداوندی میں یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (جو ایسا سمجھتے ہیں وہ ظلم کرتے ہیں) اور خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ ظالمین پر فلاح و سعادت کی راہ کبھی نہیں کھلتی۔
>
> یاد رکھو! جو لوگ خدا کے متعین کردہ نصب العین (آئیڈیالوجی) پر یقین محکم رکھتے ہیں اور نظام خداوندی کے قیام و بقا کے لئے اپنی جان و مال سے مسلسل جدوجہد کرتے ہیں اور اس بلند مقصد کے حصول کے لئے جو کچھ چھوڑنا پڑے' اسے بلا تامل و

توقف چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے مدارج معیار خداوندی کے مطابق بہت بلند ہیں اور یہی لوگ درحقیقت کامیاب و فائز المرام ہیں۔ (۲۰۔۱۹/۹)۔

مساوات کے نمونے

یہی وہ نظام تھا جس میں' کوئی فرد معاشرہ تو ایک طرف' (حضرت عمرؓ کے ارشاد کے مطابق) اگر کوئی کتا بھی بھوک سے مر جاتا تو معاشرہ کا سربراہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا تھا۔ اور یہی تھا وہ نظام جس میں مملکت کا سربراہ اس وقت تک گیہوں کی روٹی نہیں کھاتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کا مقصد مساوات انسانیہ تھا۔ آپ ہمارے واعظوں کو جھوم جھوم کر بیان کرتے دیکھیں گے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسولؐ اللہ کا کوئی کپڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا اور حضرت عمرؓ منبر پر کھڑے تھے تو دیکھا گیا کہ ان کے تہبند میں دس بارہ پیوند تھے وہ ان واقعات کو بیان کر کے تاثر یہ دیں گے کہ یہ ان حضرات کی ذاتی اور انفرادی خوبیاں تھیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ فطری نتیجہ تھا اس نظام کا جس کی بنیاد انسانی مساوات پر تھی۔ وہ نظام جس میں تمام افراد معاشرہ کا معیار زیست ایک جیسا تھا جس میں جو ایک کو میسر آتا تھا وہی سب کو مہیا ہوتا تھا۔

مساوات سے مقصود

آگے بڑھنے سے پہلے' میں اس مساوات کی تھوڑی سی تشریح ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ مساوات ایسی نہیں تھی جیسے جیل خانہ میں قیدیوں کو ایک جیسی وردی پہننے کو اور ایک جیسی روٹی کھانے کو ملتی ہے (ضمناً' اب تو جیل خانوں میں بھی یہ مساوات باقی نہیں رہی۔ ایک امیر آدمی' اور غریب آدمی' ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور عدالت سے انہیں ایک ہی جیسی سزا ملتی ہے۔ لیکن جیل خانہ میں امیر آدمی کو اے کلاس دے دی جاتی ہے اور غریب آدمی کو سی کلاس۔ اور دیگر آسائشوں کے علاوہ' یہی سی کلاس قیدی' اس اے کلاس والے کو بطور خدمت گار عطا کر دیا جاتا ہے۔ یعنی دونوں ایک جیسے مجرم ہیں لیکن ان میں سے وہاں بھی ایک آقا ہے اور دوسرا اس کا غلام) بہرحال' میں کہ یہ رہا تھا کہ مساوات انسانیہ سے مراد' جیل خانہ کی سی مساوات نہیں اس سے مراد ایسی مساوات ہے جو ایک شریف گھر کے افراد میں ہوتی ہے۔ اس میں' گھر کی آمدنی میں سے ہر ایک فرد خاندان کو اس کی ضروریات کے بقدر ملتا جاتا ہے۔ ان میں فرق ضروریات کا ہوتا ہے۔ معیار زندگی کا نہیں۔ یہی کیفیت قرآنی نظام میں افراد معاشرہ کی ہوتی ہے۔ اس میں' قوم کے سارے بچوں کو ابنائے ملت سمجھا جاتا اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد' ہر ایک کی صلاحیتوں کے مطابق تقسیم کار کر دی جاتی ہے۔ ہر فرد اس کام کو نہایت محنت اور دیانت سے سرانجام دیتا ہے جو اس کے سپرد کیا جاتا ہے' اور نظام معاشرہ اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضروریات زندگی مہیا کئے چلا جاتا ہے۔ اس میں معیار زیست تو سب کا ایک ہوتا ہے' لیکن انفرادی ذوق و پسند کا میدان وسیع ہوتا ہے۔۔ یعنی انسان اور انسان سب برابر (اس میں مرد اور

عورت کی بھی کوئی تخصیص وتمیز نہیں) معاشرہ میں مدارج ہر ایک کے جوہر ذاتی' بلندی سیرت وکردار اور حسن کارکردگی کے مطابق۔ اور ضروریات زندگی کے مہیا کئے جانے میں انفرادی حسن ذوق کے مطابق انتخاب کی گنجائش۔ جوں جوں قومی دولت بڑھتی جائے' معاشرہ کا معیار زیست بلند ہوتا چلا جائے۔ یہ ہے نقشہ قرآنی نظام معاشرہ میں مساوات انسانیہ کا۔ یہی تھی وہ مساوات جس کے لئے اس نظام کے ارکان۔۔صلوٰۃ' صیام' حج' زکوٰۃ وغیرہ۔۔کا تعین کیا گیا تھا۔ ہمارا واعظ اب بھی مساوات کا ذکر کرتا ہے' اور بڑے فخر کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن اب اس مساوات کی صرف رسم باقی ہے۔ اس کی روح اور حقیقت غائب ہے۔ اب بھی ہماری مسجدوں میں ''محمود و ایاز'' ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان میں یہ مساوات صرف مسجد کی صف تک محدود ہوتی ہے۔ مسجد سے باہر نکلتے ہی۔۔ بلکہ اس صف سے اٹھنے کے بعد' صحن مسجد میں ہی ء۔۔ محمود' محمود ہوتا ہے اور ایاز' ایاز۔۔ عرفات کے میدان میں بھی بے شک امیر اور غریب سب ایک بن سلی چادر میں ملبوس کھڑے ہوتے ہیں لیکن وہاں سے لوٹنے کے بعد' امیر حاجی جس ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رات بسر کرتا ہے' غریب بیچارا اس کا تصور مرنے کے بعد کی جنت میں ہی کر سکتا ہے اس زندگی میں کبھی نہیں کر سکتا۔

ہمارا واعظ اب بھی بتاتا ہے کہ دیکھئے۔ روزہ میں غریب اور امیر ایک ہی طرح سارا دن بھوکے اور پیاسے رہتے ہیں۔ یہ اسلامی مساوات ہے۔ لیکن وہ اس فرق کو کبھی سامنے نہیں لاتا جو ان دونوں کی سحری اور افطار میں ہوتا ہے۔ امیر کے بیٹے کی پہلی افطاری کے جشن میں جو کچھ ایک شام کو صرف ہو جاتا ہے وہ اس غریب کی سال بھر کی آمدنی سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

اجتماع عید کا منظر

اس رسمی اور رویتی مساوات کا بھانڈا بالآخر' عیدگاہ میں جا کر پھوٹتا ہے۔ جس انداز سے عید کے چاند کا انتظار ہوتا ہے اور جس ذوق وشوق اور جوش وخروش سے اس کا استقبال کیا جاتا ہے' اس سے یوں نظر آتا ہے گویا ساری قوم ہمہ تن جشن مسرت ہے لیکن صبح جب عید کے اجتماع کے لئے جائیے' تو دور ہی سے یہ آوازیں فضا میں تھرتھری پیدا کرتے دکھائی دیتی ہیں کہ ''بابا! خدا کے نام پر۔۔ چار پیسے دیتے جائیے۔ میرے بچے بھوکے ہیں۔'' ''میاں صاحب! اللہ کے واسطے میری جھولی میں کچھ ڈالتے جائیے۔ میں ایک لاوارث بیوہ ہوں جس کے بچوں کے تن پر سردی سے بچنے کے لئے کپڑا تک نہیں۔'' دوسری طرف سے یہ دلگداز اور جگرخراش صدا وجۂ سوہان روح بنتی ہے کہ ''بابا! میں تین مہینے سے بیمار اور لاچار ہوں۔ میری دوائی کے لئے کچھ دیتے جائیے۔ خدا تمہاری نماز' روزے قبول کرے گا۔'' یہ زہرہ گداز اور دل سوز آوازیں سنتے سنتے آپ عیدگاہ میں داخل ہوں' تو وہاں اس سے بھی زیادہ جگر پاش منظر دکھائی دے گا۔ فاقوں کے مارے ہوئے زرد زرد چہرے۔ افلاس وغربت کے جھنجھوڑے ہوئے ہڈیوں کے ڈھانچے' افسردہ پیشانیاں' پژمردہ آنکھیں۔ پوری فضا پر عبرت انگیز مایوسیوں کی ہولناکی مسلط۔۔ اس سے پہلے' پھر بھی ایسا ہوتا تھا کہ ہر شخص کو بالعموم اور بچوں کو بالخصوص کم

ازکم سال میں ایک بار' عید کے موقعہ پر' نئے کپڑے ضرور مل جاتے تھے اب آپ عیدگاہ کے اجتماع پر نگاہ ڈالئے۔ شاید ایک فیصد نمازی بھی ایسے نظر نہ آئیں گے جو نئے کپڑوں میں ملبوس ہوں۔ باقی سب نے انہی پرانے کپڑوں کو دھو کر تن ڈھانپ رکھا ہوگا۔ اور ان میں بھی اکثر ایسے جنکے کپڑوں کے چیتھڑے اڑے ہوئے ہوں۔۔ ادھر چندہ مانگنے والے صفوں میں جھولیاں لئے پھر رہے ہیں۔ ادھر امام صاحب صدقۂ فطر کے فضائل بیان فرما رہے ہیں۔۔ اس سے وہ سرمایہ داروں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں اور غریبوں اور محتاجوں کو تقدیر خداوندی پر شاکر رہنے کی تلقین فرماتے ہیں اور اس طرح ان کی نگاہ کبھی اس باطل نظام کی طرف اٹھنے نہیں دیتے جس کی پیدا کردہ ناہمواریوں کا نام تقدیر خداوندی رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ ہے اس قوم کا جشن عید' جسے جشن کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یاد رکھئے! جس جشن میں قوم کا ایک فرد بھی حقیقی مسرت سے محروم رہ جائے' وہ جشن' جشن نہیں۔ قوم کی بدنصیبی کا ماتم ہے۔ عید اسی قوم کی ہے جسے رزق (حضرت عیسیٰؑ کے الفاظ میں) خدا کے آسمانی نظام کی رو سے ملتا ہے اور جس میں ہر فرد معاشرہ' بلا منت غیرے' بطور استحقاق' برابر کا شریک ہوتا ہے۔ جس قوم کو انسانوں کے خودساختہ نظام کے تابع رزق ملے۔۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ چند افراد تو قارون کے خزانے کے مالک ہوں اور باقی افراد معاشرہ روٹی کے ٹکڑے کے لئے بھی ترس رہے ہوں۔ اور اگر انہیں وہ ٹکڑہ ملے بھی تو شرف و تکریم انسانیت بیچ کر ملے۔۔ اس قوم کی عید' ایک مقدس فریب سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وہ عید ہے جس کا ہلال' اس قوم کی ہنسی اڑاتا ہے' اور دنیا کی قومیں جس کی فریب خوردگی کا تماشہ دیکھنے کے لئے دور دور سے آتی ہیں۔

دین جب مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے۔ اسی (عید کی) نماز کے لئے امام نے بتایا تھا کہ اس میں چھ زائد تکبیریں ہوتی ہیں۔ تکبیر کے معنی ہیں۔۔ اللہ اکبر کا اعلان۔۔ مذہب میں چھ چھوڑ کر' چھ سو مرتبہ بھی اللہ اکبر کہئے تو اس کا' دو لفظ دہرانے سے زیادہ نہ کوئی مفہوم ہوتا ہے' نہ کوئی نتیجہ۔ لیکن دین کے نظام میں اللہ اکبر کے اعلان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ خدا کے قانون سے بالا کوئی قانون نہیں اور آسمانی نظام سے برتر کوئی نظام نہیں کائنات میں اقتدار اعلیٰ صرف خدائی نظام کو حاصل ہے اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں اکبر و اصغر کی کوئی تفریق نہیں اس لئے کہ نہ کوئی کسی کا محتاج ہے نہ محکوم۔۔ سوچئے کہ اس تکبیر میں اور نماز عید کی موجودہ تکبیروں میں کس قدر فرق ہے۔ اقبال کے الفاظ میں:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

جشنِ عید شاہیں بچوں کا حق ہوتا ہے۔۔ مردار خور کرگسوں کا نہیں!

والسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان کی سیاسی پارٹیوں کے راہنماؤں کے نام کھلا خط

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

عنوان :- چند اہم مسائل

میں ایک غیر سیاسی تنظیم ''باغبان ایسوسی ایشن'' کا سربراہ ہوں۔ میری تنظیم میں ہر مکتب فکر اور ہر سیاسی پارٹی سے متعلقہ افراد نہ صرف شامل ہیں بلکہ ''سبز انقلاب'' لانے میں بھرپور تعاون بھی کر رہے ہیں اسی پس منظر نے مجھے جرأت دلائی ہے کہ آپ سب کی خدمت میں چند گزارشات پیش کروں۔ ؎ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

(1) پچھلے دنوں برطانوی حکومت کا ایک بیان پریس میں آیا ہے کہ ''برطانیہ کی سرزمین پر کوئی بھوکا نہیں مر سکتا''۔ جس اسمبلی میں آپ بیٹھیں گے وہاں اس موضوع پر بولنے اور افراد پاکستان کو بھوک کا تحفظ دینے کے بارے میں کوئی جرأت مند مؤقف اختیار کریں گے؟

(2) علامہ اقبالؒ نے ''الارض للہ'' کے فلسفۂ قرآن کی روشنی میں غربت کو مٹانے کی بات کی ہے کیا آپ اس کو اہمیت دیں گے؟

(3) امن وسلامتی اور احترام آدمیت وہ بنیادی اقدار ہیں جن کی ہمارے معاشرے کو اشد ضرورت ہے کیا آپ امن کمیٹیوں کے قیام کو اہمیت دیں گے؟

(4) ہر عدالت کا فیصلہ اور ادارے کا جواب انگریزی میں ہوتا ہے۔ کیا آپ نفاذ اردو کے لئے کوئی جرأت مند موقف اختیار کریں گے؟

(5) اقراء سرچارج کا 10 ارب روپیہ نظام تعلیم کو ملنا چاہیئے تھا وہ خورد برد کر دیا گیا۔ کیا آپ یہ رقم نظام تعلیم کو واپس دلانے میں کوئی کردار ادا کریں گے؟

(6) قائداعظمؒ اور قومی اسمبلی نے اردو کو قومی زبان قرار دیا تھا۔ کیا آپ کراچی اور لاہور میں ''اردو یونیورسٹی'' کے قیام کی حمایت کریں گے؟

(7) ''عوام پاکستان کے لئے اور پاکستان اسلام کے لئے'' یہ وہ خواب ہے جس کو آئینی طور پر پورا کرنا باقی ہے؟ ہم سب کی نگاہیں آپ کے جرأت مندانہ موقف کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں۔

والسلام

ملک حنیف وجدانی، صدر باغبان ایسوسی ایشن، معرفت PO موہڑہ سیداں، مری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسلسلہ سال اقبالؒ 2002ء

پروفیسر فتح محمد ملک

علامہ اقبالؒ اور مولانا مدنیؒ

ہمارے ایک قابل صد احترام دانشور، فرزند اقبال نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں یہ کہہ کر ایک نئی غلط فکری کو جنم دے ڈالا ہے کہ قومیت کے مسئلے پر علامہ اقبالؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ، ہر دو کا موقف درست تھا۔ گویا علامہ اقبالؒ کا جداگانہ مسلمان قومیت کا تصور بھی برحق ہے مگر مولانا مدنیؒ کی متحدہ ہندوستانی قومیت کی حمایت بھی غلط نہ تھی۔ صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے ایشیاء میں مغربی استعمار کی تازہ ترین ریشہ دوانیوں کے پیش نظر اس سراسر غلط طرز فکر کے انتہائی خطرناک مضمرات پر غور و فکر لازم ہے۔

انڈین نیشنل کانگرس متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کی رو سے پورے برٹش انڈیا کو ایک ملک کی شکل میں متحد رکھنے میں کوشاں تھی۔ انگریز ایک آل انڈیا فیڈریشن کی صورت میں ایک متحدہ ہندوستان کو اپنی جانشین ریاست بنانا چاہتے تھے۔ برطانوی استعمار کی اس حکمت عملی کو امریکی تائید و حمایت بھی حاصل تھی۔ یہ ریاست برطانوی ہند کی تمام قوموں کی جداگانہ شناخت کو مٹا کر ایک متحدہ ہندوستانی قوم کے تصور کی بنیاد پر ہی قائم کی جا سکتی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے اسلامیان ہند کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک موڑ پر متحدہ ہندوستانی قوم کے تصور کو از روئے اسلام جائز قرار دے کر ہندوستان کو متحد رکھنے کا اسلامی جواز مہیا کیا تھا۔ مولانا مدنیؒ کے اس فتویٰ سے آٹھ سال پہلے علامہ اقبالؒ جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر برصغیر میں جداگانہ، آزادانہ خودمختار مسلمان مملکتوں کے قیام کا تصور پیش کر چکے تھے۔ وہ اسلامیان ہند پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح کر چکے تھے کہ متحدہ ہندوستانی قومیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی اجتماعی زندگی کو دین کی قلمرو سے نکال باہر کریں اور دین کو فقط ایک نجی معاملہ قرار دیں۔ متحدہ قومیت کا یہ تصور مسلمانوں سے ان کی منفرد اور جداگانہ دینی شناخت سے دستبردار ہو جانے کا متقاضی ہے مگر اسلامیان ہند یہ راہ ہرگز نہ اختیار کریں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامیان ہند نے کانگرسی علماء کے فتوؤں کو ٹھکرا کر جداگانہ مسلمان قومیت کا تصور دل و جان سے اپنا لیا۔ رفتہ رفتہ یہ تصور ایک عوامی جمہوری تحریک کا سرچشمہ بن گیا۔ اس تحریک پاکستان نے فقط چند برس کی عوامی جدوجہد کے بعد ہندوستان کی سامراجی وحدت کو توڑ کر پاکستان قائم کر لیا۔

آج جب یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فکر و خیال جس کی قوت نے برطانوی ہند کو توڑ کر پاکستان قائم کیا وہ بھی درست ہے اور وہ فکر و خیال بھی درست ہے جو برطانوی ہند کو بھارتی ہند کی شکل میں متحد رکھنے اور یوں قیام پاکستان کو روکنے میں ناکام رہا تو دل ڈرنے لگتا ہے' یہ کیسے مان لیا جائے کہ اقبالؒ کا تصور پاکستان بھی ٹھیک ہے اور اس تصور پاکستان کی اسلام کے نام پر تردید بھی کچھ ایسی غلط نہیں؟

یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ مغرب کی استعماری حکومتیں آخر دم تک ہندوستان کی سامراجی وحدت کا دم بھرتی رہیں۔ پاکستان کا قیام صرف انڈین نیشنل کانگرس اور انتہا پسند ہندو سیاسی جماعتوں ہی کی ناکامی نہیں بلکہ برطانوی اور امریکی حکمت عملی کی ناکامی بھی ہے۔ چنانچہ قیام پاکستان سے لے کر آج تک مغربی طاقتیں ہندوستان اور پاکستان کو اگر فیڈریشن نہیں تو کنفیڈریشن کی شکل میں متحد کر دینے میں کوشاں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک خارجہ پالیسی اور متحدہ دفاع کی صورت میں یہ مجوزہ کنفیڈریشن (بعد ازاں فیڈریشن) ایشیاء میں مغرب کے نواستعماری مفادات کی یکسوئی کے ساتھ حفاظت کا ''فریضہ'' سرانجام دے سکتی ہے۔ ان نواستعماری عزائم کے پیش نظر جب کوئی پاکستانی دانشور یہ کہتا ہے کہ اقبالؒ تو خیر تھے ہی ٹھیک مگر مولانا مدنیؒ بھی درست تھے تو لگتا ہے کہ ہم نے نظریاتی پسپائی کی راہ اختیار کر لی ہے۔ آج تو ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اقبالؒ اور مدنیؒ دونوں ٹھیک کہتے تھے۔ مگر اندیشہ یہ ہے کہ ہم جلد یا بدیر کہیں اس مقام پر نہ آ پہنچیں جہاں ہمیں یہ محسوس ہونے لگے کہ علامہ اقبالؒ بے شک ہمارے بزرگ ہیں مگر بات مولانا مدنیؒ ہی کی سچی تھی۔ گویا اسلامیان ہند نے پاکستان قائم کر کے ہندوستان کو توڑ ڈالنے کی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ پھر کسی کوہ ندا سے یہ آواز آنے لگی کہ لوگو! توبہ کا دروازہ ابھی تک کھلا ہے۔ تائب ہو کر عظیم تر ہندوستان کی منزل کی جانب لوٹ آؤ۔ پیشتر اس کے کہ یہ نیا فکری مغالطہ ہمیں پسپائی کے اس مقام پر لا پھینکے ہمیں قومیت کے موضوع پر اقبالؒ اور مدنیؒ کے متضاد خیالات کو ایک بار پھر تاریخی تناظر میں پرکھ لینا چاہئے۔

اپنی وفات سے فقط چند ہفتے پیشتر اقبالؒ مولانا مدنیؒ کا یہ بیان سن کر سناٹے میں آ گئے تھے کہ ''اقوام اوطان سے بنتی ہیں''۔ یہاں میں نے ''سن'' کا لفظ سوچ سمجھ کر استعمال کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقبالؒ کی بینائی جواب دے چکی تھی۔ ایک نوجوان طالب علم میاں محمد شفیع ہر روز علی الصبح آ کر ان کے ساتھ ناشتہ کرتا تھا اور اخبارات پڑھ کر سناتا تھا۔ ایک روز اخبارات کی سرخیاں سناتے وقت وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اقبالؒ بار بار ایک ہی خبر سنانے کا تقاضا کر رہے ہیں اس نے یہ خبر متعدد مرتبہ سنائی مگر علامہ ہر مرتبہ اس خبر کو پھر سے پڑھنے کا تقاضا کر دیتے تھے اس نوجوان نے جب یہ دیکھا کہ یہ جملہ سن کر کہ ''اقوام اوطان سے بنتی ہیں۔'' علامہ کا ہاتھ وہیں کا وہیں رک گیا۔ ابھی انہوں نے ایک ہی لقمہ توڑا تھا کہ یہ فقرہ کان پڑا تو انہوں نے استفسار فرمایا کہ کیا واقعی مولانا حسین احمد مدنیؒ کا قول ہے۔ جب اس نوجوان نے اثبات میں جواب دیا تو انہوں نے لقمہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور چاہا کہ وہ اس پوری خبر کو بار بار پڑھے۔ اقبالؒ سنتے رہے اور

وہ ان کے چہرے پر درد و کرب کے آثار کو نمایاں سے نمایاں تر ہوتے دیکھتا رہا۔ اس صبح انہوں نے نہ کسی اور خبر کی طرف دھیان دیا اور نہ ہی ناشتہ کیا۔ اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گئے اور نوجوان سے فرمایا کہ تم اب کالج چلے جاؤ۔

نوجوان میاں محمد شفیع کالج سے جلد از جلد فارغ ہو کر دوبارہ علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ باقی ماندہ اخبارات بھی سنا دے مگر اس نے انہیں انتہائی تکلیف دہ کیفیت میں پایا۔ علی بخش نے بتایا کہ اس وقت سے لے کر اب تک نہ کچھ کھایا پیا ہے اور نہ ہی کوئی بات کی ہے۔ بیماری کی شدت کے باعث بس ایسے ہی لیٹے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی آہ یا کراہ سنائی دے جاتی ہے۔ نوجوان گھر چلا گیا۔ شام کو پھر آیا مگر انہیں ویسا ہی چپ چاپ اور گرد و پیش سے لاتعلق پایا۔ حسب معمول شام کو ملاقاتی آتے رہے' جاتے رہے۔ علامہ دوسروں کی باتیں سنتے رہے مگر خود کوئی بات نہیں کی۔ دوسری صبح وہ حسب معمول اخبار سنانے حاضر ہوا تو دیکھا کہ علامہ سو رہے ہیں اور چہرے پر اطمینان و سکون کے آثار نمایاں ہیں۔ علی بخش نے بتایا کہ علامہ نے سحر دم کاغذ اور پنسل طلب فرمائی مگر پھر سو گئے اب انہیں جگانا مناسب نہیں۔ تم سیدھے کالج چلے جاؤ۔ اس پر میاں محمد شفیع نے علی بخش سے کہا کہ چپکے چپکے جاؤ اور دیکھو کہ علامہ نے اس کاغذ پر کچھ لکھا بھی ہے یا نہیں؟ علی بخش کاغذ لایا تو کھلا کہ اس پر اقبالؒ نے ''حسین احمد'' کے عنوان سے چند مصرعوں پر مشتمل ایک نظم قلمبند کر دی ہے۔ کالج سے واپسی پر اس نے علامہ کو ہشاش بشاش پایا۔ یہ مختصر نظم دوسرے روز اسی اخبار (روزنامہ ''احسان'' لاہور) میں شائع ہوگئی جس میں ایک روز پہلے مولانا مدنیؒ کا بیان شائع ہوا تھا۔

نوجوان محمد شفیع بعد میں ایک نامور صحافی بن گئے۔ 35 برس کے بعد انہوں نے م۔ش کے قلمی نام سے اپنے یہ مشاہدات ہفت روزہ View Point میں The Birth of a Stanza کے عنوان سے لکھ ڈالے۔ اپنے مشاہدات میں انہوں نے نظم ''حسین احمد'' کے اثر و نفوذ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس مختصر نظم کی اشاعت نے اسلامیان ہند میں عجب اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ کہ مولانا مدنیؒ کو اپنے دفاع میں نت نئے جواز تلاش کرنے پڑے۔ مولانا کی تاویلات پر مشتمل ایک مدلل جواز نامہ ''احسان'' اخبار میں بھی شائع ہوا تھا جس میں مذکورہ بالا نظم کی لفظیات' محاکات اور استعارات پر تاویلات کے پھندے ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کو ایک مرتبہ پھر پڑھ لیا جائے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
زدیوبند' حسین احمد' ایں چہ بوالعجبیست
سرود برسرِ ممبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر زمقامِ محمدِؐ عربیست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبیست

اقبالؒ کے کرب و اضطراب کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دارالعلوم دیوبند کی دینی خدمات کی دل سے قدر کرتے تھے۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ مولانا

مدنیؒ جیسا برگزیدہ عالم دین اور دیوبند جیسا عظیم دارالعلوم اسلام کے سیاسی نصب العین سے اس خوفناک حد تک نا آشنا ہو گا۔ اقبالؒ کے صدمے کی شدت کا اندازہ ان کے اس خیال سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر مولانا مدنیؒ رموزِ دیں سے اس حد تک نابلد ہیں تو پھر پورے عجم میں اسلام کے سیاسی نصب العین سے عدم واقفیت کا ماتم کرنا چاہئے۔ یہ گویا اقبالؒ کی طرف سے دارالعلوم دیوبند اور مولانا مدنیؒ کو ایک طرح کا خراج تحسین ہے۔ تاہم تمام تر احترام کے باوجود اقبالؒ نے دنیائے عجم کو مولانا کے ارشاد میں پنہاں خطرات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ، دیوبند کے عظیم الشان دارالعلوم کے سربراہ تھے اور ایک زمانے کو ان کی دینی خدمات کا اعتراف ہے، مگر ان کی سیاسی لغزشیں بھی ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہیں۔ دلی عقیدت و احترام کے باوجود یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ مولانا حسین احمدؒ تحریک پاکستان کے مخالف تھے۔ ایم اے ایچ اصفہانی، کل ہند مسلم لیگ کے 1936 کے پارلیمانی بورڈ کے اجلاس منعقدہ لاہور کی یادیں قلم بند کرتے وقت مولانا کا تذکرہ درج ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''مجھے یاد ہے کہ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے مسلم لیگ کو عملی سیاست کے اکھاڑے میں زیادہ فعال حصہ لینے کی تجویز کا خیر مقدم کیا مگر آخری روز ان دو علمائے دین میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ آئندہ عام انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی یقینی بنانے کی خاطر انتھک اور موثر پراپیگنڈے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر دیوبند کی مشینری مسلم لیگ کے لئے وقف کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ لیگ اس پراپیگنڈہ مہم کے اخراجات برداشت کرے۔ ابتدائی اخراجات کے لئے پچاس ہزار روپے طلب کئے گئے۔ جناح نے صاف بتا دیا کہ نہ تو اس وقت لیگ اتنے پیسے دے سکتی ہے اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے۔ اس پر ہر دو علمائے دین مایوس ہو کر ہندو کانگرس کی طرف راغب ہو گئے۔ ہندو کانگرس چونکہ مالی اعانت کا مطالبہ پورا کر سکتی تھی اس لئے اس کا خوب پراپیگنڈہ کیا گیا۔'' (قائداعظم جناح، ایز آئی نیو ہم، صفحات 21-20)

اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ:

''جن کے علم و تقویٰ پر مدینے کی مہر ثبت تھی، ان کی بابت جواہر لال کا ایک خط شائع ہو گیا کہ حسین احمد کو اتنے روپے دے چکا ہوں، اب وہ اور مانگتے ہیں۔ نہرو نے ان کے نام کے ساتھ نہ مولانا لکھا نہ جناب نہ صاحب۔'' (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم: اقبالؒ اور ملا، صفحات 17-18)۔

اب آیئے اقبالؒ کی اس مختصر نظم کے جواب میں مولانا کے بیانات کی جانب۔ اسلام اور قومیت کے موضوع پر مولانا کے سیاسی بیانات کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد اقبالؒ نے روزنامہ ''احسان'' کی 9 مارچ کی اشاعت

کے بعد دونوں طرف خاموشی طاری ہوگئی تھی اور یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ مولانا نے اپنے سیاسی موقف کی وکالت ترک کر دی ہے۔ مگر ہوا یوں کہ 1940ء کی قرارداد پاکستان کے بعد مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے عنوان سے ایک مختصر سی کتاب تصنیف کر ڈالی۔ اس کتاب میں انہوں نے متحدہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر اکھنڈ بھارت کے کانگریسی موقف کے اسلامی جواز پیش کر رکھے ہیں۔ مولانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کا تصور اور پاکستان کی تحریک ہر دو اسلام کے منافی ہیں اس لئے اسلامیان ہند کو مسلم لیگ کی بجائے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو کر اپنے وطن ہندوستان کو متحد رکھنا چاہئے۔

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ علامہ اقبالؒ بستر مرگ سے ہی علمائے ہند کے ساتھ اسلام اور قومیت کے موضوع پر اپنا آخری فکری معرکہ سر کر گئے تھے۔ اس موضوع پر مولانا مدنیؒ کے جواب میں علامہ اقبالؒ کا بیان ان کا آخری سیاسی بیان ہے۔ اس بیان میں اقبالؒ کا استدلال بے مثال سیاسی بصیرت اور نادر و نایاب دینی شعور کی یکجائی سے پھوٹا ہے۔ اقبالؒ کا کہنا یہ ہے کہ اگر وطن اتحاد انسانی کی بنیاد ہوتا تو آنحضورﷺ اسلام کی سربلندی کی خاطر اپنے وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ ہجرت نہ کرتے۔ آنحضورؐ کی ہجرت میں یہ دینی و سیاسی رمز بھی پوشیدہ ہے کہ اسلام میں قومیت کا بنیادی اور اٹل اصول روحانی یگانگت ہے نہ کہ وطنی اشتراک۔ ہر چند قوم وطن سے نہیں بنتی مگر قوم کو ایک وطن کی ضرورت ہوتی ہے اسی ضرورت کے پیش نظر اقبالؒ نے جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر پہلے پاکستان کا تصور دیا اور پھر اس تصور کو ایک عوامی جمہوری تحریک میں بدلنے کا سامان کیا۔ عوامی جمہوری تحریک نے بالآخر متحدہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کے تصور کو رد کر کے ہماری روحانی یگانگت کو برگ و بار لانے اور پھلنے پھولنے کے لئے یہ خطہ پاک عطا کیا جس میں بیٹھے آج ہم اس چیستان کو حل کرنے میں کوشاں ہیں کہ قومیت کے مسئلے پر اگر اقبالؒ کا موقف بھی درست تھا اور مولانا مدنیؒ کا فتویٰ بھی ٹھیک تھا تو کیونکر؟

نہیں صاحب! اقبالؒ ٹھیک تھے اور مولانا مدنیؒ غلط تھے۔ بات یہ ہے کہ مولانا مدنیؒ بھی انہی علمائے کرام میں سے ایک ہیں جو تحریک خلافت کی ناکامی اور ترکی میں نظام خلافت کی تنسیخ کے بعد اسلام کے اجتماعی مقدر سے مایوس ہو کر انڈین نیشنل کانگرس کی سرپرستی میں چلے گئے تھے۔ ان ہی برگزیدہ علمائے دین اور ان کی سیاسی جماعتوں کی جانب زیر لب اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے اپنے خطبہ الہٰ آباد میں کہنا ضروری سمجھا تھا کہ:

'To address this session of the All-India Muslim League you have selected a man who is not despaired of Islam as a living force for freeing the outlook of man from its geographical limitations, who believes that religion is a power of the utmost importance in the life of individuals as well as States, and finally who believes that Islam is

itself a Destiny and will not suffer a destiny. Such a man cannot but look at matters from his own point of view.'

یہاں اقبال کا زیرلب اشارہ قابل غور ہے۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ 1930ء میں ایک اقبالؒ کو چھوڑ کر باقی تمام مسلمان قائدین اسلام کے اجتماعی مقدر سے عملاً مایوس تھے۔ بیشتر مذہبی سیاسی جماعتیں براہ راست یا بالواسطہ متحدہ ہندوستان کا دم بھرنے میں مصروف تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے مولانا مدنیؒ کے سیاسی موقف کی تردید کرتے ہوئے اپنی آخری نثری تحریر میں یہ کہنا ضروری سمجھا تھا کہ:

''یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ ان لوگوں کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہوگئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔ زمانے کا الٹ پھیر بھی عجیب ہے ایک وقت تھا کہ ہم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفریح میں گرفتار تھے اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں۔''

یہاں اس بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دینی پیشواؤں میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے سے جدیدیت پسند علماء بھی شامل ہیں۔ ہردو نے قرارداد پاکستان کے بعد اپنی اپنی سیاسی جماعتوں کا ڈول ڈالا۔ مولانا سندھیؒ نے ترکی میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں ہی اسلامی اتحاد کے خوابوں سے دستبرداری کا کھلم کھلا اعلان کر دیا تھا۔ استنبول سے انہوں نے ریاست ہائے متحدہ ہندوستان کا جو خاکہ شائع کیا تھا اس میں انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ان کی جلاوطن سوراجیہ ہند پارٹی' انڈین نیشنل کانگرس ہی کا ایک ذیلی گروہ ہے جو مذہب کو فقط ذاتی زندگی کے دائرے تک محدود رکھتے ہوئے لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر ہندوستان کو دس ریاستوں کے ایک وفاق کی صورت میں متحد رکھنے کا خواہاں ہے۔ اسلامیان ہند میں قرارداد پاکستان کی روز افزوں مقبولیت کے زمانے میں جب انہوں نے ''جمنا' نربدا' سندھ' ساگر پارٹی'' قائم کی تب بھی ایک متحدہ ہندوستان کی بقا ہی کو اپنا سیاسی مسلک قرار دیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ''مسئلہ قومیت'' کے عنوان سے اپنے کتابچہ میں جداگانہ مسلمان قومیت سمیت ہر نوع کی قومیت کو اسلام سے متصادم ٹھہرایا اور تحریک پاکستان کے حامیوں اور رہنماؤں کو بھی کانگرسی مسلمانوں ہی کی مانند گردن زدنی ٹھہرایا۔ مودودی صاحب کے خیال میں اسلام اور قومیت میں بنیادی تضاد ہے۔ اپنی کتاب ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کی جلد سوم میں انہوں نے ''جداگانہ مسلم قومیت (یعنی پاکستان) کے تصور کو ایک غیر اسلامی بلکہ ''اسلام دشمن تصور'' قرار دیا ہے۔ یہاں مجھے اقبالؒ کا وہ تلخ سوال یاد آ گیا ہے جو انہوں نے درج ذیل شعر میں اٹھایا تھا:

مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی
اس دور کے مُلا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے اس تلخ حقیقت کا واشگاف اعلان کیا ہے کہ ''اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں''۔ چونکہ اقبالؒ کا ہمعصر مُلا اسلام کے لئے باعث ننگ و عار بن کر رہ گیا ہے اس لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اقبالؒ اس پر اسلام کی حقیقی روح کو منکشف کریں۔ فرماتے ہیں:

''جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطہ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے..... مولانا حسین احمد عالم دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے امت محمدیہ کے لئے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے..... آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اَور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملت اَور۔ دوسرا یہ کہ ازروئے قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں اس لئے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہو جانا چاہئے..... یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔ اس ملک میں رہنا ہے تو مذہب کو محض انفرادی اور پرائیویٹ چیز سمجھو اور اس کو افراد تک ہی محدود رکھو' سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی دوسری علیحدہ قوم تصور نہ کرو اور اکثریت میں مدغم ہو جاؤ۔''

ہندوستان میں دین و وطن کی اس کشمکش پر اسلام کی انقلابی تعلیمات کی روشنی ڈالتے ہوئے اقبالؒ' مولانا مدنیؒ کو اس حقیقت کی جانب متوجہ کرتے ہیں کہ:

''حضور رسالتمآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو' ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بناء پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدت عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ اگر حضورؐ نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخرالزماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔ نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا..... یقین جانئے کہ دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی مفکرین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلم عظیم ہے' بنی نوع انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری پر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔''

اس بیان میں اقبالؒ نے یہ حقیقت ایک مرتبہ پھر واضح کر دی ہے کہ حب وطن اور چیز ہے اور وطنیت اور چیز۔ وطن ایک خطۂ خاک ہے جس پر انسان اپنی عارضی زندگی بسر کرتا ہے۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ اسلام حب وطن کو برحق قرار دیتا ہے مگر وطنیت کے جدید فرنگی نظریے کو رد کر دیتا ہے۔ وطنیت کے اس سیاسی تصور کا حب وطن کے فطری جذبے سے کوئی تعلق نہیں:

''زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں ''وطن'' کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب لفظ ''وطن'' کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہو رہا ہے۔ مولانا حسین احمد صاحب سے بہتر اس بات کو کون جانتا ہے کہ اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔''

وطنیت ایک جدید فرنگی نظریہ ہے جس کے انسان دشمن مضمرات کو اقبالؒ نے اپنے آخری سیاسی بیان سے ربع صدی پیشتر اپنی نظم ''وطنیت'' میں بے نقاب کیا تھا۔ حب وطن اور وطنیت کے تضادات کو نمایاں کرنے کے لئے اقبالؒ نے اپنی اس نظم کو ایک ذیلی عنوان بھی دیا ہے جو یوں ہے: ''یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے''۔ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے اس نظم پر بھی ایک نظر ڈال لیں:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِؐ الٰہی
دے تُو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبالؒ نے اپنی نظم میں جغرافیائی قومیت کی استعماری بنیادوں کو بڑے سادہ، سلیس اور موثر انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ جغرافیائی قومیت (وطنیت) کی سیاسی آئیڈیالوجی کی بنیاد وطن نہیں بلکہ تجارتی لوٹ کھسوٹ اور سیاسی جبر واستبداد ہے۔ تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے، کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے۔ مزید برآں خلقِ خدا کو یہ آئیڈیالوجی متحارب اقوام میں بانٹ کر اسلامی قومیت کی آفاقی جڑ کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اقبالؒ اس نظریاتی وطنیت کو ایک ایسا بت قرار دیتے ہیں جسے مغربی سامراج نے تراشا ہے۔ اسلام اس بت کی پرستش کی اجازت نہیں دیتا۔ پس مسلمانوں کو چاہئے کہ محبوبؐ خدا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس سیاسی وطنیت کے تصور کو ٹھکرا دیں۔ دین اسلام ہی مسلمانوں کا حقیقی وطن ہے۔ وطن اور وطنیت کے فرق کو نمایاں کرتے ہوئے اقبالؒ بڑی قطعیت کے ساتھ بتاتے ہیں کہ:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقبالؒ وطنیت کے سیاسی تصور پر مبنی ہندوستانیت کو رد کرتے وقت ارضی اشتراک کی بجائے روحانی یگانگت کو اپنی قومیت کی بنیاد ٹھہراتے ہیں۔ اقبالؒ نے اپنی فارسی اور اردو شاعری میں جداگانہ مسلمان قومیت کا یہ تصور پیش کرتے وقت ہمیشہ آنحضورؐ کے طرز فکر وعمل کو اپنی استدلال کی بنیاد بنایا ہے۔ ''اسرار و رموز'' سے لے کر ارمغان حجاز تک انہوں نے محمد ﷺ سے وفاداری بشرطِ استواری ہی کو حقیقی اسلام قرار دیا ہے۔ اپنی اردو نظم ''جواب شکوہ'' میں انہوں نے خدا کی زبان سے یہ نوید سنائی ہے کہ:

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

اپنے آخری سیاسی بیان میں بھی اقبالؒ نے قومیت کے مسئلے پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے موقف کی ''نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات'' کے حوالے سے ہی تردید کی ہے۔ یہ غایت ایک ایسے آفاقی انسانی معاشرے کا قیام ہے ''جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔'' متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو اپنا کر ہندو اکثریت کے متحدہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد پر کسی ایسے آفاقی انسانی معاشرے کا قیام ہرگز ہرگز دائرہ امکان میں نہیں۔ ایسے میں مسلمانوں پر دو ہی راستے کھلے ہیں یا تو وہ ترکِ اسلام کی راہ اپنا کر ہندو تہذیب میں جذب ہو جائیں اور یا پھر ہندوستانی وطنیت کے بت کو توڑ کر جداگانہ مسلمان قومیت کی بنیاد پر اپنے لئے ایک الگ خطہ زمین کے حصول کی تحریک چلائیں۔

اگر خدانخواستہ، ہندی مسلمان فکر اقبالؒ سے روشنی لینے کی بجائے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے ہمعصر کانگریسی علماء کے فتوؤں کے جال میں اسیر ہو کر رہ جاتے تو یہ بلاشبہ ترکِ اسلام کی راہ ہوتی۔ پہلے اسلام کا سیاسی نصب العین ترک کر کے ہندوستانیت کا سیکولر نصب العین اپناتے اور پھر رفتہ رفتہ اسلام کا اخلاقی نصب العین بھی ترک کر کے، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے لفظوں میں ''مسلمانان ہندو مزاج'' بن کر رہ جاتے۔

سرکردہ علمائے دین کا متحدہ ہندوستانی قومیت پر ایمان لے آنا یا دوسرے لفظوں میں' سب سے پہلے ہندوستان' اور آخر میں اسلام' کا سیاسی مسلک اپنا لینا ایک ایسی دلخراش حقیقت تھی جو پایانِ عمر' اقبالؒ کے لئے سوہانِ روح بن کر رہ گئی تھی۔ جداگانہ مسلمان قومیت اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے مابین نظریاتی آویزش کو اقبالؒ نے دین و وطن کی کشمکش یا روح و بدن کی معرکہ آرائی کا نام دیا ہے۔ دین کے اجتماعی مسلک سے بیشتر علمائے دین کی کنارہ کشی کے ہولناک نتائج کا خیال کر کے اقبال کا دل کانپ کانپ اٹھتا تھا۔ ایسے میں وہ تڑپ کر یہ سوال اٹھایا کرتے تھے کہ :۔

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے؟

یہ اقبال کی شاعری اور اقبال کی فکر کا فیضان ہے کہ جب متحدہ ہندوستانی قومیت یا جداگانہ مسلمان قومیت یعنی متحدہ ہندوستان یا قیام پاکستان میں سے کسی ایک راہ فکر و عمل کے انتخاب کا وقت آیا تو سوادِ اعظم نے اقبال کی فکری اور قائداعظم کی سیاسی قیادت میں قیام پاکستان کی حمایت کی۔ یوں بالآخر اسلامیان ہند کی اجتماعی رائے نے کانگرسی علماء کے تصور اسلام کو رد کرتے ہوئے اقبالؒ کے تصور اسلام کو اسلام کی حقیقی تعبیر مان لیا۔

اس حقیقی اسلام کی سربلندی کی خاطر 1947ء میں پاکستان قائم ہو گیا مگر آج تک پاکستان میں اسلام کی انقلابی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کا سامان نہ ہو سکا۔ یہ اسی غفلت کا شاخسانہ ہے کہ آج ہمارے ہاں پھر سے اسی شکست خوردہ ذہنیت کے مظاہر سامنے آ رہے ہیں جن کا مشاہدہ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی متذکرہ بالا علماء کی ذہنیت میں کر چکی ہے تب اور اب میں فرق صرف اتنا ہے کہ کل اگر چند علماء فرنگی نظریات کو مشرف بہ اسلام کرنے میں سرگرداں تھے تو آج یہ کام علماء کی بجائے جدیدیت پسند دانشور کر رہے ہیں۔ اسے کہتے ہیں زمانے کا الٹ پھیر!

(بشکریہ نوائے وقت)

سورۃ النحل

(دسواں درس.....آیات 94 تا 99)

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باہمی معاہدات

عزیزان من! آج اپریل 1977 کی 27 تاریخ ہے اور درس قرآن کریم کا آغاز سورہ النحل کی آیت 94 سے ہو رہا ہے۔ (16/94)۔ آیت 91 میں یہ کہا گیا تھا کہ (**و اوفوا بعھد اللہ اذا عٰھدتم**) خدا کے ساتھ جو تم نے معاہدہ کیا ہے اسے پورا کرنا۔ اور میں نے یہ واضح کیا تھا کہ جسے ہم کہتے ہیں ایمان لانا' مسلمان ہونا' اس کے لئے ایک معاہدہ کرنا ہوتا ہے خدا کے ساتھ' اپنی وھبی اور اکتسابی صلاحیتیں' محنت کا ماحصل جو کچھ بھی ہے جسے ہم جان اور مال کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ مومن یہ سب کچھ بیچ دیتا ہے اور اس کے صلے میں اس کی قیمت میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ یہ ایک باہمی معاہدہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان سے یہ تاکید کی جاتی ہے کہ معاہدہ کیا ہے تو اب اس کو پورا کرنا۔ اسلام تمہارا ایمان' تمہارا مسلمان ہونا اس وقت تک ہی باقی رہے گا جب تک تم اس معاہدے پہ قائم رہو گے۔ یہ تو ان سے تاکید کی۔ باقی رہا یہ کہ صاحب فریق ثانی بھی تو اس معاہدے میں ہے اور فریق ثانی تو خود خدا ہے تو اپنے متعلق یہ چیز کہی کہ اگر خدا کی طرف سے بھی تم دیکھو کہ بالفرض محال یہ معاہدہ پورا نہیں ہوتا (**مسئولا**) (25/16) تم اس کے متعلق سوال کر سکتے ہو۔ اتنی تاکید ہے معاہدے کی یہ تو وہ معاہدہ تھا جو خدا اور بندے کے درمیان ہوتا ہے اور اس سے نیچے اترئے تو پھر یہ معاہدے یا وعدے جسے کہتے ہیں وہ ایک ہی بات ہوتی ہے۔ عھد اور معاہدہ۔ انسانوں کا آپس میں بھی تو ہوتا ہے۔ قوموں کے درمیان معاہدات ہوتے ہیں' انفرادی طور پر آپس میں معاہدے بھی ہوتے ہیں وعدے بھی ہوتے ہیں۔

قول و قرار

یہ محض ایک قانونی فرق ہوتا ہے ان دونوں میں ورنہ وہ بات ایک ہی ہے۔ وعدہ یا قول اقرار جسے آپ کہتے ہیں کوئی بات بھی جو دوسرے سے طے کر کے آپ کہہ دیں کہ ہاں میں ایسا کروں گا وہ وعدہ ہو گیا یا معاہدہ ہو گیا اور یہ چیز معمولی نہیں ہے۔ ابھی ابھی یہ کہا ہے کہ یہ تو مسلمان ہونے کی اولین شرط ہے۔ بڑی اہمیت حاصل ہے معاہدے کو بھی اور وعدے کو بھی جو آپس میں کیا جائے۔ یہ Lightly لینے کی بات نہیں ہے۔ انسان کے سارے کیریکٹر کا دارومدار اس کے وعدے پر ہوتا ہے۔ وعدہ کر کے تو نہیں بھول گیا' مکر تو نہیں گیا' اس میں جھوٹ تو نہیں بولا اس نے۔ یہ چیز کہ وعدہ خلافی یا وعدے کا پورا کرنا مسلمان ہونے کے لئے ایک شرط ہے۔ پہلے ادوار کے متعلق تو کچھ ہم زیادہ نہیں جانتے ابھی کل تک ہمارے معاشرے کی یہ کیفیت تھی۔ اپنے بچپن کا ایک چھوٹا سا واقعہ پیش خدمت کرتا ہوں کہ مسلمانوں

کے متعلق غیر مسلم کیا یقین رکھتے تھے۔ بٹالہ ہمارا شہر تھا جہاں ہم رہتے تھے۔ گلی سے بالکل باہر بازار تھا اور بازار میں مخلوط دکانیں ہندوؤں مسلمانوں کی ہوتی تھیں۔ ایک ہندو کی دوکان تھی گلی کے ساتھ ہی تیل بیچنے والا ہیرا تیلی۔ میں چھوٹا سا تھا یونہی باہر نکلا تو اس نے یہ کہا کہ دیکھئے میاں جی سنیے ایک بات۔ وہ ہندو مسلمانوں کو مسلمانوں کے بچوں تک کو بھی میاں جی کہا کرتے تھے۔ ایک بات سنئے اس کے سامنے ایک گاؤں کا گنوار سا جیسے بظاہر کہیئے وہ تیلی تھا گاؤں کے تیلی تیل لاتے تھے اور اس کے پاس بیچتے تھے وہ پھر آگے لوگوں کے پاس بیچا کرتا تھا۔ دونوں کے مابین کوئی تکرار ہو رہی تھی تو اس نے مجھے کہا کہ دیکھو میاں جی دیکھو یعنی اس نے کہا ھنیر پے گیا یہ مجھے لفظ یاد ہیں اس کے۔ (آ دیکھنا میاں جی ھنیر پے گیا۔ میں کہیا کیہ ہویا لالہ۔ کہن لگا جی ایہ مسلمان ہو کے جھوٹ بولدا اے وعدے اوں مکر گیا جے۔ مسلمان ہو کے جھوٹ بولدا اے وعدیوں مکر گیا جے۔) آج سے یہ بہر حال کوئی ساٹھ برس پہلے کی بات سمجھ لیجئے۔ بازار کا ہندو یہ کہہ رہا تھا!! ساری عمر یہ بات میرے دماغ میں گونجتی رہی کہ اس وقت تک ابھی مسلمان کا شعار یہ تھا۔ اس نے کہا یہ کہ ہنیر پے گیا جے میاں جی ایہ ویکھو مسلمان ہو کے جھوٹ بولدا اے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اس نے جھوٹ بولا تھا یا یہ یونہی کہہ رہا تھا بہر حال اس کے سامنے اس نے یہ بات کہی تو اس کے بعد اس مسلمان کے کریکٹر کی یہ کیفیت تھی۔ گاؤں کا دہقانی تیلی غریب آدمی یعنی وہ اتنی محنت مشقت کے بعد اس زمانے میں سارے سودے میں سے اس کو کوئی روپیہ اٹھنی ملتی تھی۔ اس کا ردعمل یہ تھا اس کی غیرت اور اس کی حمیت کا اس نے کہا (آ اولالہ! جناچر تیکر گل ہیرے تے چراغ وچ ہوندی سی ناپئی اونا چر تکر جھگڑا ٹھیک ہیگا سی توں ہن کہیا اے مسلمان ہو کے جھوٹ بولیا ہیگا او میرے اسلام تے حملہ اے جو کچھ سی چھڈ یا میں' (میں نے چھوڑ دیا) اتے ٹر گیا اپنا کھوتا لے کے۔) ادھر بھی یہ کریکٹر تھا۔ وہ اس کے بعد میں آوازیں دیتا رہا (اوئے آ جا اوئے آ جا ٹھیک اے اوئے نہیں ہو جائے گا۔ اوہنوں اوتھوں ایوں کر کے کہن لگا نہیں' ہن توں کہیا اے مسلمان ہو کے جھوٹ بولیا تے ہن گل مک گئی اے تیری میری۔ چھڈ یا میں جو کجھ وی سی۔) آج تک یاد ہے عزیزان من! اور ہمارے رونے کی تو اصل بات یہ ہے کہ ہمارا ماضی ان واقعات سے بندھا ہوا ہے اور حال اس میں گزارا کرنا پڑتا ہے کہ بڑی سے بڑی ذمہ دار ہستی اس دور کی خواہ وہ مشرق میں ہو خواہ وہ مغرب میں ہو اس کمبخت سیکولرازم کی سیاست نے یہ کر دیا ہے کہ یہ وعدہ کر کے پھر جو ہے نا مکر جانا کوئی بات ہی نہیں رہی! اور جو جتنا کاریگری سے اس میں جھوٹ بولے جائے مکر جائے فریب دے اتنا بڑا کامیاب لیڈر تصور کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پہ یہ چیز آ گئی ہے۔ سولون نے دیر ہوئی یہ بات کہی تھی کہ آپس میں قوموں کے معاہدے مکڑی کا جالا ہوتے ہیں۔ معاہدہ تو' اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے اپنے سے طاقتور کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اور آج جو سیاست چل رہی ہے میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ میکاؤلی سیاست ہے۔ اس کی The Prince پڑھنے کی کتاب ہے۔ سارا زور وہ اس پہ دیتا ہے کہ اول تو چاہئے یہ کہ وعدہ کر کے پھنسو ہی نہیں۔ اگر مجبوراً معاہدہ کرنا پڑ جائے تو اسی وقت ذہن میں یہ خیال رکھو کہ اسے میں نے پورا نبھانا نہیں ہے۔ الفاظ اس قسم کے رکھو کہ جب جی چاہے اس کے دوسرے معنے کسی طرح انہیں پہنائے جا سکیں۔ اور اگر کسی صورت میں بھی یہ ممکن نہ ہو کوئی راستہ نکلنے کا نہ ہو تو پھر جاؤ۔ یہ بائبل ہے دور حاضرہ کی سیاست کی! یہ جو دنیا میں اس وقت اس قدر خلفشار' انتشار' پریشانیاں' مصیبتیں' کوئی شخص ایسا نہیں اس وقت اس دور میں جسے

اطمینان حاصل ہو۔ چھوٹے سے چھوٹا رعایا میں سے بڑے سے بڑا صاحب اقدار کسی کو اطمینان حاصل نہیں ہے۔ یہ کیا بات ہے۔ کسی کو اس کے متعلق یقین ہی نہیں ہے کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اس کے دل میں وہی بات ہے یا جو اس وقت مجھ سے وعدہ کر رہا تھا کل اس پہ قائم رہے گا' جسے مومن کہا جاتا ہے ہم تو اس کا ترجمہ ہی ایمان والا کہتے ہیں نا ایمان لانے والا' مومن کے معنے ہوتے ہیں امن کی ضمانت دینے والا۔ ساری دنیا کو امن کی ضمانت دینے والا اور اسی لئے خدا کی ایک صفت بھی تو المومن ہے (**المومن المهيمن العزيز الجبار المتكبر**) (59/23) تو مومن کے معنے اگر صرف ایمان لانے والا ہی ہو یہ دوسری اگلی بات آتی ہے ایمان لانے والا جسے ہم کہتے ہیں۔ پہلی چیز تو ہمارے ذہن میں ہی نہیں رہتی کہ ایمان لانے والا ہو تو خدا المومن کس طرح سے ہوتا ہے وہ کس پہ ایمان لاتا ہے۔ اس کا تو مادہ الف م ن ہے جس کے معنے بنیادی امن کے ہیں۔ خود بھی امن میں رہنے والا اور دوسرے کو امن میں رکھنے والا۔ امن عالم کی ضمانت دینے والا۔ یہ تھا المومن۔ تو یہ ضمانت کس طرح سے دی جاتی تھی۔

المومن

پہلی چیز ضمانت کی عزیزان من یہ کہ دنیا کو معلوم تھا کہ ان کے ہاں ایک ضابطہ آئین وقوانین ہے جسے یہ قرآن کہتے ہیں۔ اس ضابطے کے متعلق ان کا یہ ایمان ہے (**لامبدل لكلمت الله**) اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ جب آپ کسی قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ کرتے تھے کسی سے کوئی بات کہتے تھے تو اس کے لئے آپ کو قرآن کی سند دینی پڑتی تھی' تو قرآن کی سند کے معنے یہ تھے ان لوگوں کے نزدیک کہ اس میں اب تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ جس مملکت کے آئین اور ضوابط کے متعلق دنیا کو یہ یقین ہو کہ اس میں کسی حالت میں تبدیلی نہیں ہوگی امن تو خود مل گیا اس کو۔ اس سے بڑی ضمانت کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے اس آئین میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ ان کے ساتھ معاہدہ کرنے والے کے لئے صرف یہ ضروری تھا کہ وہ اس کو دیکھ لے قرآن کو کہ یہ چیز اس میں ہے' اگر ہے تو پھر اسے امن ہوگیا کہ صاحب اب اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی یہ بدل ہی نہیں سکتے اس کو' قومی حیثیت سے تو یہ تھی کیفیت ان کے المومن ہونے کی۔ آج آپ اس سیکولر نظام کے تابع خود فریبی یا فریب دہی کے لئے کچھ نام اس کا رکھ لیجیے سب سے بڑا جو نام آج رکھا ہے جیسے کہ آسمان سے اتری ہوئی یہ جمہوریت۔ کوئی بھی نظام آپ کے ہاں کا ہے جس دن جی چاہے اپنے ہی پارٹی کی کثرت سے اس میں تبدیلی کر لیجئے۔ تو جس آئین کی کیفیت یہ ہو اور ساری دنیا میں یہی آج نظام رائج ہے کہ آج جو آئین اور ضابطہ ہے جس کو دیکھ کے آپ نے اس قوم کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا وہ کل کو آئین اور ضابطہ ہی باقی نہیں رہتا۔ اگر حکومت بدلتی ہے تو پھر تو نہ انجن بماند نہ انجینئر ی' وہ تختہ الٹ گیا۔ جسے کہتے ہیں ختم ہوگیا اور اگر حکومت کی کیفیت یہ ہو کہ اس میں برسر اقتدار انسان آتے رہیں جاتے رہیں جس ضابطے کے مطابق انہوں نے حکومت کرنی ہے وہ نہیں بدلنا' حکومتوں کی تبدیلی سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا۔ جب آئینِ حکومت غیر متبدل رہنا ہے تو حکومت میں برسر اقتدار کوئی لوگ آئیں کوئی لوگ جائیں اس قدر امن عالم کی ضمانت دینے والی تھی یہ چیز اس اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو المومن کہا تھا اور خدا کی اس کتاب کو ماننے والے جو تھے ان کو بھی مومن کہہ کے اس نے پکارا۔ امنِ عالم کی ضمانت دینے والے اور جب یہ اتنی بلند سطح پر بین الاقوامی سطح پر ان کی

کیفیت یہ تھی تو باہمی معاملات میں یہ چیز کیوں نہ ہوگی صاحب' غیروں کے ساتھ ہی نہیں اپنوں کے ساتھ ہی اور قرآن نے تو اس کی کہیں کوئی تخصیص ہی نہیں کی کہ اپنوں کے ساتھ جو وعدہ کرو اس کا تو ایفا کرو اور غیروں کے ساتھ کیا ہے' جب جی چاہے مکر جائے جب جی چاہے پھر جائے۔ آج ہمیں اس کی کوئی خاص اہمیت نظر نہیں آتی کہ قرآن وعدے کے متعلق اتنا زور کیوں دے رہا ہے یعنی ہم نے وعدے کو ایسا Lightly لیا ہوا ہے اور وعدہ تو عزیزان من جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں بڑی چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوتا ہے۔ جب آپ کسی دوست سے کہتے ہیں کہ ہاں بھئی میں چار بجے آ جاؤں گا۔ یہ بھی وعدہ ہے اور یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ پھر وہ چار بجے تو کوئی بھی نہیں آیا کرتا۔ انفرادی طور پہ آپ کا چاہے کوئی دوست ہی ہو (1 کدی کوئی جج ڈھکی ہیگی اوس ویلا اونہے دسیا ہویا آ جانگا' بیٹھے ہوئے سارے جیہڑے ایہناں نے سدے ہوئے نیں استقبال کرن واسطے برات دے۔ اوہ چاؤل ٹھنڈے ہوندے نیں پئے۔ وخت پیا ہویا ہوندا اے گھر والیاں لئی دوسریاں لئی چہ میگوئیاں ہور ہیاں نیں۔ اوہ جس ویلے اوہنوں پچھوبئ باراں وجے کہیا سی تن وجے آئے او کہن لگے جنجاں دا معاملا جو ہویا۔) یعنی وہ بات بھی ٹھیک کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کے وعدے پر نہیں اعتبار کیا جا سکتا یہ تو سو تھے۔ عزیزان من! جب کسی قوم کے افراد کی آپس میں بھی یہ حالت ہو جائے کہ کسی کے وعدے پہ اعتبار ہی نہ ہو تو آپ سوچئے کہ یہ جو ہمیں ہر وقت ایک دوسرے کے متعلق کچھ دھڑکا لگا رہتا ہے اس دھڑکے کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب وہ بات کر رہا ہوتا ہے تو یقین نہیں ہوتا کہ واقعی ہی He means it یعنی اس کے دل میں یہ بات ہے جو زبان سے یہ کہہ رہا ہے اور اگر وہ کہہ کے چلا جاتا ہے تو پھر اس کے بعد یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ پتہ نہیں کل کو یہ کیا کہہ دے اور یوں پھر جانے والا جو ہے اب اسے کچھ ندامت بھی نہیں شرم بھی نہیں۔ (1 وہ چراغ تیلی دی گل تے بڑی وڈی ہیگی سی)' اب وہ حمیت اور غیرت بھی چلی گئی اس قوم کے اندر سے' کسی شخص کو وعدے سے مکرتے ہوئے جھوٹ بولتے ہوئے کوئی عار ہی محسوس نہیں ہوتی' اس لئے کہ وہ روز اوپر دیکھتا ہے کہ کل انہوں نے کیا وعدے ہم سے کیے تھے آج کیا ہو رہا ہے اور اس طرح سے جسے brazen-facedly کہتے ہیں' ڈھٹائی کے ساتھ یعنی اور کچھ نہیں تو پہلے اس سے کچھ ندامت ہوا کرتی تھی' کچھ تھوڑی سی شرم آ جایا کرتی تھی آنکھیں جھک جایا کرتی تھیں' لیکن اب یہ معاشرے کا شعار اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اب کسی کو کسی قسم کی ندامت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ احساس ہی مٹ جاتا ہے۔ اور یاد رکھئے انسان اور حیوان میں ایک مابہ الامتیاز شے یہ بھی ہے کہ انسان کو ندامت آتی ہے حیوان نادم نہیں ہوتا۔ جب اس سطح کے اوپر انسانوں کا معاشرہ آ جائے اور اس میں سے بھی پھر مسلمانوں کا معاشرہ کہ جسے امن عالم کا ضامن قرار دیا گیا تھا ان کی باہمی کیفیت یہ ہو جائے آپ سوچئے کہ معاشرے میں پھر کس قدر ہر قلب کے اندر جہنم نہیں بھر جائے۔ بھروسہ ہی نہیں کسی پہ' اعتماد ہی کسی پہ نہیں صاحب آپ کو! یقین نہیں کر سکتے۔ ویسے ہی نہیں کر سکتے اور اگر وہ اس کے ساتھ انشاءاللہ کہہ دے تو پھر تو وہیں سمجھ لیا جاتا ہے کہ نہیں' آج یہ چیز کہنی شروع کر دی ہے لوگوں نے جب وہ کہتا ہے کہ میں انشاءاللہ چار بجے آؤں گا۔ (1 اوہ کہندا اے گل پکی کر ان شااللہ چھڈ وچوں۔) جس قوم کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ ویسے بات کرے تو پھر بھی کچھ چلئے ففٹی پرسنٹ ہی سہی قابل اعتماد ہے اگر اس میں خدا کو بیچ میں وہ لے آیا ہے تو وہ سو فیصد سمجھ لیا گیا ہے جھوٹ بول رہا ہے۔ ان چیزوں کے لئے آپ بالآخر مذہب کی طرف آیا کرتے

تھے نا؟ یہ کہا جاتا تھا نا کہ نہ بھئی تمہارا مذہب نہیں اجازت دیتا۔ تمہارا دھرم اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ خدا اور رسول ﷺ اجازت نہیں دیتے۔ شریعت اجازت نہیں دیتی۔

دروغ گوئی

عزیزان من! اور جب آپ کو یہ شریعت کا فتویٰ بتایا جائے کہ از روئے شریعت زندگی کی ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے یعنی شرم اور ندامت تو ایک طرف رہی اگلی بات ایسی تھی کہ اس میں بہر حال مذہب اجازت دے دیتا ہے۔ چلو یہ بھی سہی۔ اجازت کے معنے ہوتے ہیں رخصت کے کہ تمہارا جی چاہے تو تم سچ بولو جی چاہے تم جھوٹ بول لو' اسے اجازت کہتے ہیں۔ یعنی اسلام تو اس کا بھی تصور نہیں کر سکتا کہ یہ کہا جائے کسی سے کہ بھئی اس معاملے میں تمہارا جی چاہے تو تم برقرار رکھنا وعدے کو جی چاہے تو مکر جانا پھر جانا۔ رخصت کی بات بھی نہیں ہے۔ یہ بھی کریکٹر نہیں ہے اور جب یہ کہا جائے کہ شریعت کی رو سے واجب ہو جاتا ہے جھوٹ بولنا۔ واجب آپ کو معلوم نہیں اصطلاح ہے شریعت کی۔ فرض تو وہ ہو جاتا ہے جو خدا کی طرف سے ہو' اس سے نیچے درجے کے اوپر انہوں نے ایک لفظ واجب رکھا ہوا ہے۔ واجب ہے اس کے اوپر اور ترک وجوب جو ہے جو چیز واجب ہوتی ہے اس کا ترک کرنا جو ہے وہ گناہ کا موجب ہوتا ہے یعنی اگر جھوٹ نہ بولا جائے تو تم گنہگار ہو جاؤ گے۔ یہ فتوے آج دیئے جاتے ہیں بدقسمتی سے اس ملک کے اندر جس کو کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے حاصل کیا گیا تھا اس ملک کے اندر سب سے بڑی دعویدار جماعت جو ہے اسلامی نظام کے قیام کی' جماعت اسلامی کے امیر کا یہ فتویٰ ہے!! میں کوئی بات لگی لپٹی نہیں کہا کرتا' مئی 1958 کے ترجمان القرآن کے اندر یہ چیز موجود ہے۔ جب ان کے اوپر یہ الزام عائد کیا ان لوگوں نے کہ جو اس بنا پر جماعت کو چھوڑ کے الگ ہوئے تھے' انہوں نے (مودودی صاحب نے) جواب میں یہ بات کہی تھی کہ یہ کون سا غیر اسلامی اقدام ہے جو میں نے کیا ہے؟ شریعت کی رو سے زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر اس میں جھوٹ نہ بولا جائے تو انسان گنہگار ہو جاتا ہے۔ اور (معاذ اللہ معاذ اللہ) ہزار بار توبہ کے بعد یہ کہتا ہوں کہ اگر اسلام کی یہ تعلیم ہے جھوٹ بولنا واجب' اسلام کی اس تعلیم کے اوپر سب سے پہلے تو رسول عمل کرتا ہے' وہیں سے شریعت بنتی ہے۔ خدا کا حکم ہو اس کا رسول اس پہ عمل کرے تو اگر شریعت حقہ کا فیصلہ یہ ہے کہ ایسے وقت میں جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ سوچو تو سہی کہاں جا کے بات پڑتی ہے؟ ترے نشتر کی زد شریانِ قیس ناتواں تک ہے۔ لیکن ان کو اس سے کیا غرض! انہیں تو اپنی اس ساری سیاست اور ساری زندگی کے متعلق شرعی سند کی ضرورت ہے کہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ عزیزان من! مومن تو ایک طرف رہا انسانیت کی تاریخ کو آپ دیکھئے کہ کروڑوں انسان آتے ہیں چلے جاتے ہیں بالکل مچھروں کی طرح مینڈکوں کی طرح' اس ساری انسانیت کی تاریخ میں یہاں وہاں کچھ روشنی کے مینار آپ کو نظر آتے ہیں۔ اور وہ جو روشنی کے مینار زندہ جاوید آنے والوں کے لئے جو شمع ہدایت بنتی ہے جن کی سیرت و کردار۔ میں اسلام کی بات نہیں کر رہا اس سے بھی پہلے کی کر رہا ہوں۔ میں ان کی بات بھی نہیں کر رہا کہ جنہیں قرآن کریم نے Specifically متعین طور پر انبیاء کرام کہہ کے پکارا ہے۔

سقراط کا کیریکٹر

اس ساری تاریخ میں وہ روشنی کے مینار جو آپ کو نظر آتے ہیں ان کے کریکٹر کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ہزار خطرات ان کے سامنے تھے انہوں نے جھوٹ نہیں بولا۔ زندگی کی اہم ضرورت جان کی حفاظت سے زیادہ اور کون سی ضرورت اہم ہوگی۔ اس تاریخ کے اندر جو مفکرین کی تاریخ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے سقراط جسے کہا جاتا ہے' بطور شہادت اس کا کریکٹر پیش کیا جاتا ہے صاحب! قانون کی رو سے یہ وہاں جائز تھا کہ اگر وہ اپنے اس ملک سے باہر چلا جاتا جان بچ سکتی تھی۔ جرم اس کے اوپر یہ تھا کہ تم یہ جو تعلیم دیتے ہو اس سے قوم کے نوجوانوں کے اخلاق بگڑتے ہیں اعتقاد بگڑتے ہیں ایمان بگڑتا ہے' تم دیوی دیوتاؤں کے خلاف یہ کچھ کہتے ہو۔ میں اس میں نہیں پڑنا چاہتا کہ بحث کیا تھی۔ بحث یہ تھی کہ اس جرم کے لئے سزا موت تھی۔ اسے جھوٹ نہیں بولنا پڑتا تھا۔ دو صورتیں تھیں یا تو یہی وہ کہہ دیتا کہ غلط بات ہے میں ایسا نہیں کرتا۔ دوسری چیز بچنے کی یہ بھی تھی کہ وہ کسی طرح سے بھی ہو ملک سے نکل جاتا۔ ان کی Jurisdiction ملک سے باہر تھی نہیں۔ ایسے ایسے اس کے شاگرد موجود تھے بڑے بڑے لوگ' ان کی ریاستیں تھیں' انہوں نے یہ پیش کش کی کہ آپ نکل جایئے آپ کی زندگی بڑی قیمتی ہے۔ کیا کہنے اس شخص کے صاحب' پتہ نہیں اس کا مقام کیا تھا! اس نے کہا کہ میری زندگی اسی صورت میں قیمتی ہے کہ میں حق کی آواز بلند کرتا ہوں' اگر میں حق کی آواز چھوڑ کے یہاں سے جان بچانے کی خاطر چلا جاؤں تو میری زندگی قیمتی کیا رہی وہ تو تم نے خود ہی قیمت اس کی کھودی۔ زہر کا پیالہ ہاتھ میں دینے کے بعد بھی پوچھا اس پیالہ دینے والے نے' (حکومت کا نمائندہ جو تھا) کہ مجھے کہا گیا ہے کہ اگر سقراط اب بھی یہ بات کہہ دے کہ میں یہ بات نہیں کہوں گا یہ نہیں کہ میں نے نہیں کہی تھی جھوٹ نہیں بولنا۔ اب بھی وہ یہ کہہ دے کہ میں یہ نہیں کہوں گا تو پیالہ اس سے لے لینا ہے۔ اس نے کہا کہ جو بات سچی ہے اس کے متعلق میں کیسے کہہ دوں کہ میں نہیں کہوں گا یہ لیا اور غٹا غٹ پیالہ پی گیا!! نبی نہیں ہے' انبیاء میں شمار نہیں قرآن نے Specifically کیا' مومنین میں بھی شمار نہیں ہو رہا۔ کیوں آج تک اس شخص کا نام ہے؟ اسی لئے میں ان کے الفاظ میں Invertid Comas میں کہوں کہ ''تمہاری شریعت حقہ کی خلاف ورزی کی'' اس لئے شہرت بقائے دوام حاصل ہوگئی اس کو۔ یہ بات قرآن کے مطابق اس نے کی تھی اس لئے حیات دوام حاصل ہوگئی۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

یہ قلندر تھا' اور قرآن نے انہیں قلندروں کی داستانیں اپنے اندر محفوظ رکھ لی ہیں۔ قیامت تک ان کو حیات جاوید دے دی۔

فرعون کا دربار

فرعون کا دربار۔ عزیزان من جب میں کہا کرتا ہوں قہر مانیت کا مجسمہ' نام اس کا اصطلاحی طور پہ استبداد کے لئے تاریخ میں چلا آتا ہے' فرعون' اس کے دربار کے ساحرین نے حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھا تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں موسیٰ اور

ہارون کے خدا پر۔ شیر کی سی گرج کے ساتھ دھاڑ کے ساتھ وہ بولا کہ ہیں میری اجازت کے بغیر اور یہ کیفیت۔ انہوں نے کہا کہ حق کو حق کہنے میں کسی کی اجازت کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا انجام تمہیں معلوم ہے۔ کہنے لگے کیا انجام۔ اس نے کہا کہ ابھی ٹکڑے ٹکڑے کرادوں گا' پھانسی پہ لٹکا دوں گا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ خالی خولی دھمکی نہیں ہے' فرعون کہہ رہا ہے یہ بات' ایک ہی سیکنڈ میں اس پہ عمل ہو جائے گا۔ انہیں اس کا پتہ تھا کہ کون کہہ رہا ہے۔ ایمان لائے وہ جیسا میں نے پچھلے ہی اپنے درس میں کہا تھا ایمان لائے ہوئے بھی ابھی لمبا عرصہ نہیں گذرا تھا(**ثم استقاموا**) والی بات بھی نہیں تھی چند ثانیے تو ہوئے تھے' لیکن ایمان اسے کہتے ہیں عزیزان من۔ اس نے یہ کہا۔ قیامت کی دھمکی تھی شدید ترین عذاب جو دیا جا سکتا ہے کسی کو وہ تھا یہ۔ انہوں نے کیا کہا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا(**فاقض ما انت قاض**) اور جو تیرے جی میں آئے فیصلہ کر دو' ہم نے حق بات کہہ دی ہے ہم اس میں جھوٹ نہیں بول سکتے۔ کیوں یہ بے خوفی پیدا ہو گئی۔ کیوں اتنے نڈر ہو گئے اگلے فقرے میں بات ہے عزیزان من ساری۔ یہ سارے جھوٹ یہ جن کے لئے وجوب کہہ رہے ہیں اور زندگی کی یہ اہم ضرورتیں' ایمان کی ضرورت تو یہ ہو گی نہیں' آخرت کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہو گی' اسی زندگی کی ضرورتیں کمبخت ہوں گی اسی طبعی زندگی کی کوئی ضرورتیں ہوں گی۔ جواب ان کا یہ تھا دھمکی دیتے ہو یہ کچھ کر دیں گے' تم جو کچھ ہمارے ساتھ کر سکتے ہو اس طبعی زندگی کی حد تک کر سکتے ہو اس سے آگے تو تمہارا ہاتھ ہی نہیں جا سکتا اور زندگی یہاں تو نہیں ختم ہو جائے گی یہ تو جوئے رواں ہے آگے بھی چلے گی' آ پکڑ وہاں ہمیں آ کے' صرف ایمان انسان کے اندر یہ بے خوفی پیدا کرتا ہے کہ' ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق۔ منافقت کہتے کسے ہیں۔ اسی جھوٹ کا نام منافقت ہوتا ہے۔ کافر کو تو قرآن نے جہنم میں کہا منافق کو جہنم کے پست ترین درجے کے اندر لے آیا وہ' کافر انکار کرتا ہے جھوٹ تو نہیں بولتا' غلط بات ہے دھڑلے سے کہتا ہے' اس پہ بھی اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب صورت یہ ہو کہ جانتے بوجھتے دیدہ دانستہ زندگی کی کسی ضرورت کے لئے جھوٹ بولنے کی اجازت ہی نہیں بلکہ واجب ہو جاتا ہے از روئے شریعت' سوچئے کہ کوئی شخص پھر اس پہ اعتبار کر سکتا ہے' اور ان کی جراتوں کا عالم یہ ہے۔

رسولؐ خدا پر بہتان

عزیزان من' مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف رکھئے گا' بات بڑی دور تک پہنچی ہوئی ہے' اپنے جھوٹوں کو اور اپنے فریبوں کے لئے جواز پیدا کرنے کے لئے یہ اس قسم کی شریعت پیش کی اور پھر کچھ شرم نہیں آئی یہ کہتے ہوئے کہ خود رسول اللہ ﷺ صحابہ کو تلقین کیا کرتے تھے کہ ضرورت پیش آئے تو جھوٹ بول لیا کرو۔ تو حضورؐ نے اپنے مخالف کعب بن اشرف یہودی کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ سیرت پیش کی جا رہی ہے دنیا کے سامنے عزیزان من اس ذات گرامی کی جس نے اپنی شدید ترین مخالف قوم کے سامنے کھڑے ہو کے کہا تھا کہ تم مجھ سے کہتے ہو کہ تمہارے سچے ہونے کی دلیل کیا ہے معجزہ دکھاؤ' انہوں نے کہا کہ معجزہ تو دلیل نہیں بنا کرتا دلیل یہ ہے کہ (**قد لبثت فیکم عمرًا من قبله افلا تعقلون**) میں نے ساری عمر تمہارے اندر بسر کر دی ہے کیا تم اس سے نہیں اندازہ لگا سکتے کہ یہ ایک سچے کی زندگی ہے یا جھوٹے کی زندگی ہے۔ کسی کو جرات نہیں ہوئی کہ انگشت نمائی کر سکے' آج اس رسول اقدس و اعظمؐ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اپنے

مخالفین کو دھوکے سے قتل کرا دیا کرتا تھا اور صحابہ کو جب بھیجا ہے قتل کرنے کے لئے تو انہوں نے کہا کہ اس کے لئے ہمیں کوئی جھوٹ بولنا پڑے تو اجازت ہے' کہا کہ ہاں اجازت ہے (اللہ اکبر) عزیزان من یہ ہے پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کے مدعیوں کی کیفیت!! اسی لئے تو اس مملکت کا بیڑہ غرق ہو گیا' یہ معاشرہ تباہ ہو گیا' بدترین معاشرہ اس وقت ہے دنیا میں اس قوم کا۔ میں نے کہا ہے نا کہ یہ جو لوگ سیکولرازم کے حامی ہیں ان پر تو گلہ ہی کوئی نہیں ہے انہوں نے تو پہلے دن سے کہا کہ کوئی بات غیر متبدل نہیں ہے' یہ تو اقامت دین کے مدعی ہیں اسلامی نظام لانے کے لئے صبح سے شام تک یہ کچھ دعوتیں دے رہے ہیں وہ یہ اسلام پیش کر رہے ہیں اور یہ ہے وہ شریعت جس شریعت کے سانچے میں ڈھال کے انہوں نے اگلی نسل کو تباہ کیا ہے' یہ سارے نوجوان جن کو اسلام کے نام کے اوپر یہ استعمال کر رہے ہیں ان کا کریکٹر یہ بنا دیا ہے انہوں نے' جن کو پہلے دن سے تعلیم یہ دی جائے کہ ضرورت کے وقت جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے دشمن کے خلاف فریب کرنا سنت ہو جاتا ہے' ان نوجوانوں سے آپ کیا توقعات کریں گے' ساٹھ برس پہلے کا ہیرا تیلی یہ کہتا تھا کہ (1 میاں جی ہنیر آ گیا' مسلمان ہو کے جھوٹ بولدا اے۔) آج ان کی تعلیم کی یہ کیفیت ہے اسلام کے علمبرداروں کی کہ آج دنیا یہ چیز کہے گی کہ دیکھئے صاحب مسلمان ہو کے جھوٹ نہیں بولتا حالانکہ شریعت کی رو سے واجب تھا اس کے اوپر' ترک وجوب ہے۔ یہ ہے وہ کردار جو پیدا کیا جا رہا ہے اگلی نسلوں کے اندر' ہم تو ڈوبے تھے ہمارا بیڑہ غرق تو ہوا تھا' آنے والی نسلوں کو' اور جب انہیں کہا جائے کہ صاحب شریعت کا یہ فیصلہ ہے تو نہ صرف یہ کہ انہیں اس فریب اور جھوٹ پہ شرم نہیں آئے گی وہ فخر کریں گے کہ ہم اتباعِ شریعت کر رہے ہیں' ان کا تو قصور کوئی نہیں ہے ان کو بتایا ہی یہ گیا ہے۔ ان کے کسی وعدے پہ پھر کوئی یقین آپ کر سکتے ہیں؟ ان کے معاہدے پہ دنیا کی کوئی قوم کسی طرح سے بھروسہ کر سکے گی۔ یہ سیکولرازم سے ہٹ کے ہم یہی کہتے تھے نا کہ نہیں خدا کے لئے اسلام پہ' شریعت پہ' دین پہ مدار رکھو یہاں۔ یہ ہے وہ شریعت جس کے اوپر مدار ہو گا آپ کا۔ ان سیکولرازم کے حامیوں کو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ قرآن نے یہ چیز کہی ہے (**ولا تتخذوا ایمانکم دخلًا بینکم**) اپنی قسموں کو اپنے وعدوں کو آپس میں فساد ڈالنے کے لئے سپر نہ بنایا کرو۔ پہلی چیز اس میں یہ ہو گی کہ دنیا میں تمہارا اعتماد اٹھ جائے گا (**فتزل قدم بعد ثبوتها**) یہ جو قدم جم گئے ہیں تمہارے اکھڑ جائیں گے۔ عزیزان من! ایک دوست جس پہ آپ بھروسہ کرتے چلے آ رہے ہیں ایک دفعہ بھی آپ سے جھوٹ بول جائے' مکر جائے' وعدہ خلافی کر جائے قدم اکھڑ جاتے ہیں اس کے بعد۔ ٹھیک ہے تعلقات دوبارہ استوار بھی ہو جائیں تو ہو جائیں وہ بات نہیں رہتی عزیزان من۔

ایفائے عہد

پھر وہ بات نہیں رہتی۔ قومی حیثیت سے کہا کہ یاد رکھو معاہدات اور وعدوں کی بڑی سختی سے پابندی کرو۔ کتنی عظیم چیز ہے یہ' اور اگر یہ نہ کیا تو جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں گے' تمہارا تو قدم جما ہوا اس لئے تھا کہ تمہیں پتہ تھا کہ جو بات میں نے کہی ہے اس کے خلاف میں کر ہی نہیں سکتا سوچ نہیں سکتا' جما ہوا ہے نا قدم۔ لڑکھڑاتا تو اس وقت ہے کہ جس نے اب کچھ کہا بعد میں کچھ کہے گا کل کچھ اور کہے گا تو ایک مرکز پہ تو وہ قائم ہی نہیں ہے اور قوموں کی نگاہ میں تمہارے جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں گے کہ کوئی بھروسہ نہیں کرے گا تم پہ (و

تذوقوا السوء) یادرکھوعذاب میں پھنس جاؤ گے مبتلا ہو جاؤ گے اس کے بعد' بات تو صرف اتنی تھی کہ تم نے وعدہ کیا تھا وعدہ خلافی کر رہے ہو جو ہمارے نزدیک کوئی شے ہی نہیں' قرآن کہتا ہے کیوں یہ عذاب آئے گا(**بما صددتم عن سبیل اللہ**) یہ تو خدا کی طرف جانے والوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کردے گی یہ چیز تمہاری' خدا کی طرف دعوت تو تم ہی دے رہے ہو' پھر تمہاری اس دعوت پہ بھی کون بھروسہ کرے گا۔ آپ نے غور کیا ہے کہ جس بات کو کبھی ہم اہمیت ہی نہیں دیتے آپس میں وعدے کرنے کی' اس کی اہمیت قرآن کی رو سے کیا ہے' ایک وعدہ خلافی جو ہے' ایک قول یا اقرار کا توڑ دینا جو ہے' ملی یا انفرادی طور پہ تمہارے پاؤں میں لغزش پیدا کردے گا اور یہ بات خدا کی طرف جانے والے راستے میں رکاوٹ بن جائے گی۔(**ولکم عذاب عظیم**) اور عذابِ عظیم میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ آج جس سے کہئے کوئی جس کے دل میں کچھ ہے بھی احترام دین کا مذہب کا بھی کہ بھئی کسی طرح سے امانت دار' سچے' زندگی کے اندر یہ چیزیں تو پیدا کرو اب ایک اور مل گیا ہے بہانہ ہمیں کہ صاحب یہ چیزیں تو اسلامی نظام قائم ہوگا تو اس وقت یہ چیزیں ممکن ہوں گی یعنی اپنے دوست سے جو تم اس وقت وعدہ کر رہے ہو کہ کل میں تمہیں یہ دے دوں گا یہ اس کے اوپر پورا رہنے کا امکان بھی اس وقت ہوگا جب اسلامی نظام قائم ہو جائے گا۔ کس قدر خود فریبی عقلِ بہانہ ساز۔ میں تو اس چراغ تیلی کی بات اس زمانے کی بتا رہا ہوں کہ جب اسلامی نظام تو ایک طرف انگریزوں کی غلامی تھی' آج کیا ہو گیا' ٹھیک ہے پوچھا جاتا ہے کہ آج کیا ہو گیا بات یہ غصے کی نہیں جھلاہٹ کی نہیں' چڑچڑا ہونے سے کچھ بات نہیں بنے گی بات ہمیں سوچنی پڑے گی کہ ہو کیا گیا' ہو یہ گیا کہ (**ظھر الفساد فی البر والبحر**) سیاست آ گئی میکاؤلی جس کا مدار ہی جھوٹ پہ ہے۔ دین آپ کا باقی رہا تھا۔ شریعت کا فیصلہ دے دیا کہ جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔ تو یہ حالت نہ ہو معاشرے کی تو پھر اور کیا حالت ہو۔ لیکن یہ تو ہمارے یا آپ کے بس میں تھا کہ ہم صداقت شعار رہیں یا جھوٹ کو وجوب بنالیں لیکن یہ جو قانون فطرت کی رو سے اس کا نتیجہ تھا کہ (**ولکم عذاب عظیم**) اس کو تم اپنی مرضی سے نہیں بدل سکتے' اور جب انفرادی معاہدے کی یہ کیفیت ہے تو پھر جو خدا کے ساتھ عہد کیا تھا پھر یہاں قرآن لایا ہے۔(**ولا تشتروا بعھد اللہ ثمنًا قلیلًا**) اس معاہدے کی خلاف ورزی جسے تم نے زندگی کی بعض ضرورتیں کہا ہے طبعی زندگی کا ہی مفاد ہوگا نا' یہ جو اس کا ترجمہ ہوتا ہے نا کہ خدا کے ساتھ معاہدے کو تم تھوڑی سی قیمت کے ہاتھ نہ بیچا کرو تو اس کے یہ معنے نہیں کہ کوئی لاکھ روپے کا لائسنس لے کے بیچ دیا کرو۔(1) پنجاں ستاں رُپئیاں دے بھاء نہ ویچیا کرو۔) وہ یہ بتا رہا ہے کہ یہ بڑی قیمتی چیز ہے' تھوڑے پیسیاں اچ نہ ویچ دینا(**ثمناً قلیلًا**) قرآن میں جہاں جہاں یہ چیز آئی ہے اس نے کہا یہ ہے کہ یہ ٹھیک ہے زندگی کی ہر متاع قیمتی ہے' اس قابل ہے اسے خریدا جائے' لیکن جب بھی اس دنیا کی کسی قیمت اور کسی ثمن اور کسی متاع اور آپ کی ذات کی زندگی آخرت کی زندگی جو ہے اس میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے تو قرآن کی رو سے یہاں کی ہر قیمت ثمنِ قلیل ہوتی ہے۔ یہاں بات ایک روپے اور لاکھ روپے کی نہیں جو اس زندگی کی متاع ہے اس حالت دوام کی متاع کے مقابل میں قرآن نے یہ کہا ہے کہ وہ ہر قیمت ثمن قلیل ہے اس لئے قرآن جب اس کو ثمن قلیل لائے گا کہیں بھی' اس کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ مستقل اقدار' وہ Permanent Values ý اس Value کے مقابلے میں یہاں کی ہر Value ثمن قلیل ہے۔ اس لئے اسے یوں نہ بیچ دیا کرو۔ اس

Temptation میں نہ آ ؤ اب دیکھئے کہ دونوں جو Values دونوں قیمتی جو ہیں' قرآن ہے عزیزان من! کیا بات ذہن میں آ گئی۔

ثمن اور قیمت

قیمت کا لفظ ذہن میں آیا اور یہ عرب ہیں صاحب۔ قیمت کے معنے بھی قیمت ہوتا ہے ثمن کے معنے بھی قیمت ہوتا ہے کسی چیز کی۔ قرآن یہاں یہ ثمن ہی کیوں لایا قیمت قام سے ہے جس کے معنے توازن ہیں۔ اس کے معنے ہیں کہ دو چیزیں جب برابر ہو جائیں تو وہ چیز اس کی قیمت ہو جاتی ہے' برابر ہو جائیں تو۔ ٹھیک ہے آپ کے ہاں ڈالر کا Exchange دس روپے ہے دس روپے میں ڈالر خرید لیا جائے تو یہ ڈالر کی قیمت ہوگئی وہ برابر ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی دوسری شے جو خریدی یا بیچی جائے وہ اس کے برابر نہ ہو یونہی طے تم کر لو کہ بھئی اتنے دے دو تو میں دے دیتا ہوں تو یہ ثمن ہوتی ہے۔ کہا کہ وہ جو ویلیوز Permanent جو اخروی زندگی ہے اس کی تو کوئی متاع بھی ایسی نہیں جس کی قیمت ہو سکے۔ یہ جو تم آپس میں طے کر کے بیچتے ہو یہ ثمن ہے۔ جتھے آ کے انسان کہندا اے اچھا دس او توں کنے پیسے دینا ایں۔ یہ ثمن ہے۔ جہاں یہ چیز ہو کہ دیکھ لو نرخ یہ ہے' اس پہ اب کوئی چیز بیچیں گے تو وہ قیمت اس کی ہو جائے گی' (**ثمناً قلیلاً**) اس کی قیمت تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ کیوں نہیں ہو سکتی قیمت۔ کہا بات سیدھی سی ہے' جہاں دعویٰ کرتا ہے دلیل دیتا ہے۔ (**انما عندالله هو خير لكم ان كنتم تعلمون ما عندكم ينفد وما عندالله باقٍ**) تو اس لئے ہے کہ یہاں جو بھی تم اس کی' میں پھر وہ قیمت ہی کہوں گا ہمارے ہاں وہ دوسرا لفظ ہی یہاں نہیں اردو میں' کوتاہ دامنی ہے زبان کی' اسی لئے ترجمہ نہیں ہو سکتا قرآن کے الفاظ کا جو میں کہا کرتا ہوں۔ کہا کہ جو کچھ بھی تم اس کے عوض میں لے لو وہ جو ہے وہ طبعی زندگی کی جنسوں میں سے کوئی جنس ہوگی' یہ تو بہرحال رہنے والی چیز نہیں بلکہ یہ تو زوال پذیر ہے' باقی نہیں رہ سکتی' اور وہ جو تم نے بیچا ہے اس کے عوض میں وہ تھی کہ جو کبھی بھی فنا نہیں ہو سکتی تھی' ہمیشہ باقی رہنے والی چیز تھی' کبھی ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کی قیمت وہ ہو سکتی ہے جو کل ختم ہو جانے والی کی ہو؟ اس نے ایک اصولی بات بتا دی کہ یوں یہاں کوئی متاع حیات جو ہے وہ قیمت نہیں ہو سکتی مستقل قدر کی۔ وہ مستقل قدر ہے اور اس کے مقابلے میں ہر چیز فانی ہے' (**وما عندالله باقٍ**) کیا بات ہے (**ولنجزين الذين صبروا اجرهم باحسن ما كانوا يعملون**) یہ جو تم جلدی سے جھوٹ بول دیتے ہو' جلدی سے سودا کر لیتے ہو تو یہ اس لئے ہے کہ تم تھوڑا سا بھی صبر نہیں کرتے' یوں میں لفظ وہی ابھی لا رہا ہوں' یہاں ہم بھی اس معنے میں بولتے ہیں جو قریب قریب عربوں کے معنی میں آ جاتا ہے کہ او تھوڑا جیا صبر تے کرنا سی' سہار کے معنوں میں برداشت کے معنوں میں معنے اس کے استقامت کے ہوتے ہیں۔ ایک طرف اتنی بڑی کشش نظر آ رہی ہے تھوڑا سا جھوٹ بولنے سے اتنا کچھ مل جاتا ہے دوسری طرف یہ نظر آ رہا ہے کہ اس سے وہ ویلیو جو ہے وہ ہاتھ سے چلی جاتی ہے۔ جس کی کوئی قیمت نہیں ہے اس دنیا کے اندر۔ کہتا ہے یہ کشش جلدی سے غالب آ جاتی ہے تم پہ' تمہاری کشتی ڈولنے لگتی ہے' آیئے عربوں کے ہاں سے جو میں کہا کرتا ہوں صابورہ کے معنے پوچھیں وہ صبر کہاں استعمال کرتے تھے' کشتی جب طوفانوں میں پھنستی یا طغیانیوں میں آتی یا موجوں کے گرداب میں پھنستی ان کی لہروں کے اوپر ڈولنے لگتی جسے کہتے ہیں نا تو اس کا توازن برقرار رکھنے کے لئے وہ ایک طرف ایک بڑا سا پتھر رکھ دیتے تھے تا کہ یہ ڈولے نہیں۔ یہ جو ایک وزن' پتھر رکھتے

تھے اسے وہ صابورہ کہتے تھے جس کا مادہ صبر ہے' لگی کشتی ڈولنے کے لئے' نا بھئی' صابورہ سے کام لو یہاں' توازن نہ بگڑنے پائے' ڈگمگانے نہ پائے قدم' یہ کرلو گے تو (**ولنجزین الذین صبروا**) تم دیکھو گے کہ اس کا بدلہ تمہیں کتنا ملتا ہے وہ چیز تو نکل جائے گی وہ دس ہزار روپیہ تو جاتا رہے گا (**اجرھم باحسن ما کانوا یعلمون**) تم نے جو اس وقت یہ عمل کیا ہے اور بڑا حسین عمل ہے دیکھو ہم کس قدر خوبصورت بدلہ اس کا دیتے ہیں' بنیاد ہی دین کی اس پہ ہے عزیزان من کہ زیادہ Value کس چیز کی ہے تمہارے ہاں؟ ہے ہی یہ ساری چیز تقابل کی' بات ہی Comparison کی' جہاں یہ تقابل نہیں آتا کشمکش نہیں آتی وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ رہبانیت اور تصوف اور یہ خانقاہیت جو ہے یہ دین نہیں ہے' وہاں فرار ہے اس چیز پہ کہ آپس میں ٹکراؤ نہ ہو' تقابل نہ ہو ان چیزوں کا' انتہائی فرار یہ ہے کہ جنگل میں چلا جائے آدمی' جنگل میں جا کے بسنے والا جہاں کوئی دوسرا انسان نہیں وہاں نہ وہ گناہ کرسکتا ہے نہ نیکی کرسکتا ہے' یہ نیکی اور گناہ تو ٹکراؤ کے وقت کی بات ہے کہ وہاں تم کیا فیصلہ کرتے ہو۔ پتھر تو ساری عمر کوئی گناہ نہیں کرتا' لیکن نیکی بھی تو نہیں کرسکتا' یہ جسے اس نے صبر کہا ہے وہ تو اسی وقت ضرورت ہے کشتی آپ کی موجوں کے اوپر ٹھیلتی جا رہی ہے۔ بندرگاہ میں باندھ کے رکھی ہوئی کشتی جو ہے اس کو ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن کشتیاں بندرگاہ میں امن کی جگہ رکھنے کے لئے تو نہیں بنائی جاتیں۔ وہ بنا بنا کے وہیں باندھتا چلا جاتا ہے خانقاہیت یہ ہے۔ وہ کشتی کے مقصد سے واقف نہیں ہے' بیکار ہے (**حبطت اعمالھم**) ساری محنت کشتی بنانے میں ضائع چلی جائے گی' محفوظ تو رہے گی وہ کشتی (**احسن ما کانوا یعملون**) یہ کیا ہوگا' یہ اجر کیا ہوگا' یہ حسین اجر کیا ہوگا ایک کے بعد دوسری آیت میں وہ واضح کئے چلے جاتا ہے (**من عمل صالحًا**) جس نے بھی ایسے کام کئے جو اس کی ذات کی صلاحیتوں میں نشوونما پیدا کرتے چلے جائیں یہ ہے نا Value تقابل کی۔ جس نے بھی ایسے کام کئے۔ اب یہ دیکھئے بات ایک اصولی چلی آ رہی ہے لیکن کس طرح وہ دو لفظوں میں بہت اہم حقیقتیں بھی لاتا چلا جاتا ہے جو نگاہوں سے اوجھل تھیں اور وہ اہم حقیقت جو انسان' انسان میں نہیں' مردوں کے استبداد نے جس کو ہمیشہ نگاہوں سے اوجھل رکھا وہ یہ تھی کہ مرد اور عورت میں مساوات نہیں ہوسکتی۔ یہ ہمیشہ پست رہے گی۔ یہاں یہ ذکر نہیں آ رہا ہے لیکن (**من عمل صالحًا من ذکرٍ او انثیٰ وھو مؤمن**) عورت ہو یا مرد ہو' مومن ہونا اس کے لئے شرط ہے۔ خود بھی امن میں رہنے والا دوسروں کو بھی امن کی ضمانت دینے والا' جس کی بھی یہ کیفیت ہوگی کیا ہے وہ جو اجر احسن جسے کہا ہے (**فلنحیینہ حیٰوۃً طیبۃً**) دو لفظوں میں بات کہہ گیا' نہایت خوشگوار اور پاکیزہ زندگی اس کو عطا کریں گے۔ اس سے آگے اور چاہئے کیا عزیزان من۔ بڑا جامع لفظ طیب آتا ہے قرآن میں' شجر ثمر بار کو طیب کہتے ہیں' بہترین پھل دینے والا درخت' نہایت خوشگوار یعنی اس سے زیادہ جامع لفظ ہی کوئی نہیں ان کے ہاں یہ بتانے کے لئے زندگی کی ہر قسم کی آسائشیں' نرمیاں' خوشگواریاں' سرفرازیاں یہ سب آ جاتی ہیں طیب۔ پھر دوسری طرف اس کی پاکیزگی' اس کی لطافتیں یہ ساری چیزیں لفظ طیب میں آ جاتی ہیں۔ اس کا بدلہ ہم تمہیں یہ دیں گے یہاں حیات طیب اسی زندگی میں حیات طیب گزرے گی اور یہ اس لئے کہ (**ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون**) یہ کچھ یونہی بطور انعام کے نہیں مل جائے گا۔ خیرات کے طور پہ نہیں مل جائے گا' بہشتِ فی سبیل اللہ والی بات نہیں ہے۔ اتنا بڑا انعام تو مل رہا ہے اس پہ کچھ ہوسکتا تھا نا کہ اللہ تعالیٰ تیرا شکر جسے

ہم کہتے ہیں بڑا احسان ہے‘اس نے کہا کہ کچھ نہیں ہم نے احسان وحسان کچھ نہیں کیا(**اجرھم باحسن ما کانوا یعملون**) تم نے محنت کی اس کی مزدوری ہم نے دے دی۔

آخر یہ نقصان کا سودا کیوں؟

سوال یہ پیدا ہوااور پیدا ہوتا ہے ہر دل میں‘ کہ بات تو یہ بڑی صاف واضح سی ہے ایک طرف اتنی بڑی قیمتی متاع دوسری طرف اس کے اس قدر جنس کا سدا آنی جانی چیز جو ہے‘ تو سمجھ میں تو یہ بات آ جاتی ہے کہ اسے اس کے عوض بیچنا نہیں چاہئے‘ یہ بڑا ہی گھاٹے کا سودا ہے‘ لیکن پھر یہ کیا بات ہے کہ انسان صاحب عقل ہوش ہونے کے باوجود اس چیز پہ آمادہ ہو جاتا ہے اور ہر روز آمادہ ہی کیا ہوتا ہے ہر روز ہم تو کرتے ہی یہ ہیں‘ تو یہ ہوتا کیا ہے پھر؟ ہے نا اہم سوال؟ ہے نا اس قابل کہ اس کا جواب محفوظ رکھا جاتا؟ یہاں پہنچنے کے بعد‘ میں نے عرض کیا ہے کہ وہ خدائے علیم وبصیر ہے جو ہمارے دل میں آج گزرتی ہے اس کے علم میں تو اس وقت بھی تھی‘ اس لئے وہ ہمارے دل میں گزرتی ہوئی بات جو ہے‘ یہ بات تمہارے دل میں گزرتی ہوگی‘ یا یہ روز کا مشاہدہ تمہارا ہوگا‘ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ لوگ بڑے سمجھدار ہیں روزمرہ کے کاروبار میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک دھیلے کی کمی نہیں کھاتے صاحب۔ جب تک پسینہ نہیں آ جاتا اس وقت تک سودا نہیں ختم کرتے یہ۔ تو اس معاملے کے اندر کیا ہو جاتا ہے پھر‘ پاگل تو یہ ہیں نہیں یہ کیا ہوتا ہے! کہا انسان کے جو اپنی مفاد پرستی کے جذبات ہیں وہ عقل وہوش پہ غالب آ جاتے ہیں۔ یہی ہوتا ہے نا عزیزان من۔ یہ جو جذبات ہیں جو ایسے مقام پہ ان اتنی عظیم ویلیوز کے اوپر بھی وہ غالب آ کے نگاہوں میں چمک‘ جھوٹی سی کشک ملمع سازی‘ فریب کاری‘ تصنع یہ کچھ پیدا کر دیتے ہیں‘ اس کا نام شیطان ہے۔ وہ جو ہمیں بعد میں آ کے ہم نے اپنے اس جھوٹے فریب کی خاطر باہر کھڑا کر لیا ہے کہ

کار بد تو خود کرے لعنت کرے شیطان پر

وہ اپنے سے باہر ایک ہم نے رکھ لیا ہے لعنت کرنے کے لئے کوئی۔ ہم تو نہیں یہ کرتے۔ وہ جی وہ شیطان ہے انسان کے اوپر‘ شیطان کرتا ہے وہ سارا کچھ۔ بالکل ٹھیک ہے‘ یہ فریب یہ کہیں کہ باہر نہیں کھڑا‘ یہ انسان کے اندر ہی ہے اور انفرادی طور پہ بھی انسانوں ہی کے اندر ہے‘ اجتماعی طور پر بھی یہ انسانوں ہی کے اندر ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا شیطان بنا دیجئے۔ وہ سنا ہے جہاں اس کو وہ پتھر مارتے ہیں وہاں بھی وہ دو چھوٹے ہیں ایک بڑا ہے اس کے اندر۔ اجتماعی طور پر بھی یہی چیز ہے۔ افراد کے اپنی مفاد پرستی کے جذبات جب غالب آتے ہیں اس پہ تو وہ تو جتنی بھی اس قسم کی ویلیوز‘ اقدار۔ اصول ہیں وہ ان کو فراموش کر دیتا ہے بھول جاتا ہے پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اقوام میں بھی یہ ہوتا ہے۔ معاہدہ شکنی کب ہوتی ہے‘ جب وہ قوم دیکھتی ہے کہ اس کے اپنے مفاد جو ہیں وہ معاہدہ توڑنے سے حاصل ہوتے ہیں وہ توڑتا ہے‘ یہی چیز وہاں بھی ہوتی ہے‘ بڑا شیطان سہی‘ کہا اس کے لئے کرنے کا کام کیا ہے یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ایسے وقت میں لغزش نہ آنے دیا کرو اپنے پاؤں میں ثابت قدم رہا کرو تا کہ تمہاری کشتی ڈولے نہیں۔ اس کے لئے کرنا کیا چاہئے کہا(**فاذا قرات القرآن فاستعذ باللہ من الشیطٰن الرجیم**) ترجمہ ہمارا یوں ہوا کہ جب تم قرآن پڑھنے لگو(**فاستعذ باللہ**) میں یہی لفظ رہنے دیتا ہوں۔ عمل اس پہ کس طرح

کیسے ہوا کہ جب قرآن پڑھوتو شروع میں کہواعوذ باللہ من شیطان الرجیم پورا ہو گیا یہ کام! عزیزان من! ذرا تھوڑے سے سکون قلب سے بات سوچئے کہ علاج اگر اتنا ہی تھا' عام طور پہ ہر روز صبح تلاوت قرآن بھی کی جاتی ہے اور یہ تو اب ہمارے ہاں یہ ایک مستقل چیز ہوگئی ہے کہ جب بھی قرآن پڑھنے لگتے ہیں پہلے اعوذ باللہ من شیطان الرجیم پڑھتے ہیں ہم پھر مسجدوں میں قرآن سنتے ہیں قرآن تو بہت پڑھا جاتا ہے اور ہر پڑھنے سے پہلے اعوذ باللہ من شیطان الرجیم کہا جاتا ہے' اس نے کہا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے' تو کیا واقعی اس سے یہ ہوجاتا ہے پھر؟ پھر ہم بچے رہتے ہیں ان تمام چیزوں سے جن سے بچنے کے لئے کہا تھا کہ یہ کیا کرو؟ کبھی کھڑے ہو کے سوچو تو سہی یہ واقعہ ہے نا کہ اس کے بعد یہ کچھ نہیں ہوتا' یہ واقعہ ہے نا کہ اس تلاوت اور قرات قرآن کے باوجود باہر جا کے یہ سارے قرآن پڑھنے والے ہم لوگ یہی کچھ کرتے ہیں' تو یہ بات تو نہ ہوئی پھر' تو اس کے بعد دو ہی باتیں سامنے آئیں کہ یا تو (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ جو قرآن نے کہا ہے یہ صحیح نہیں اس سے نہیں یہ ہوتا۔ یا یہ کہ جو اس نے کہا تھا ہم وہ نہیں کرتے' تو جب تک آپ نام کے بھی مسلمان رہتے ہیں پہلی بات کہنے کی تو جرات نہیں ہوسکتی آپ کو۔ بات تو دوسری ہے۔ دوسری بات کہنے کی بھی جرات نہیں ہوسکتی کہ فریب نفس کا پردہ چاک ہوجاتا ہے اس سے۔ اگر یہ بات سمجھ میں آجائے کہ قرآن کی قرات اور تلاوت وغیرہ کے متعلق جو اس نے کہا ہے کہ یہ کیا کرو تو بچ جاؤ گے ان تمام لغزشوں سے اگر اس کے بعد یہ صورت ہو کہ یوں کرنے سے بھی آپ بچ نہ سکیں تو اس کے بعد یا تو سوچ سمجھ کے دیکھنا ہوگا کہ قرآن کہتا کیا ہے اور یا پھر اس کے بعد قرآن کی قراتیں اور تلاوتیں چھوڑ دیں گے آپ' یہ جو سارے جنہوں نے چھوڑی ہوئی ہیں وہ اس لئے چھوڑی ہوئی ہیں اور جو اس کے باوجود کئے جارہے ہیں وہ اس لئے ہے کہ عقل فریب نفس کے پردے سے باہر نہیں نکلنا چاہتے' ورنہ

ے نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

قرآن عام اعلان

شیطان کی گرفت سے تو نہ یہ قرآن پڑھنے والے بچے ہوئے ہیں نہ قرآن کو چھوڑنے والے بچے ہوئے ہیں۔ کیا بات ہے (**اذا قرات القراٰن فاستعذ بالله من الشيطٰن الرجيم**) پہلے تو یہ قرآن جو لفظ ہے بڑی اہم چیز ہے' عام طور پہ تو یہ قرآت' صحیح اس کے متعلق بتایا جاتا ہے پڑھنے والی چیز لیکن یہ حقیقت میں عبرانی زبان کا ایک لفظ ہے قرءً جس کے معنے ہوتے ہیں جس میں ہم مملکت کی طرف سے ایک اعلان ہوتا ہے اسے Proclaimation کہتے ہیں' اعلامیہ' عام اعلان۔ قرآن کے معنے یہ Proclaimation' عام اعلان نوع انسانی کے لئے' قرات القرآن کے معنے ہیں اعلان کرنا Proclaim کرنا ایک چیز کو' اعلان کردینا بلکہ Announce سے وہ آگے ایک درجہ ہوتا ہے Proclaimation جسے کہتے ہیں۔ وہ حکومتوں کی طرف سے جس قسم کے اعلانات ہوتے ہیں دیکھیں ہے نا اس میں بڑا فرق ہوتا ہے Proclaimation ہوتا ہے' عام اعلان کرنا ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر اپنے متعلق یہ چیز ہوتی ہے' جب بھی یہ چیز تم کرو' آگے ہے (**فاستعذ بالله**).

اعوذ باللہ

یہ **فاستعذ** یہ جو چیز ہے عملاً ہم یوں عمل پذیر جس پہ ہوتے ہیں کہ اس سے پہلے **اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم** پڑھ لیا کریں' **اعوذ باللہ من الشیطٰن**' یہ وہی چیز ہوئی پڑھ لیا کرو' قرآن بھی پڑھ لیا کرو اور قرآن سے پہلے یہ بھی پڑھ لیا کرو۔ پڑھ لیا ٹھیک ہے مطلب حل ہو گیا' سفر پہ جانا ہے ٹائم ٹیبل رکھا ہے' کیا کرو' میاں ٹائم ٹیبل Consult کر لیا کرو۔ اب اسے پڑھ رہے ہیں آپ ٹائم ٹیبل کو۔ نہایت صحت سے پڑھ رہے ہیں' اگلا کہتا ہے کہ نہیں اوئے یہ جو تم نے پڑھا ہے لفظ یہ' یہ لکھا ہوا ہے Jhelum جھلم نہیں ہے یہ جہلم ہے' یوں پڑھو۔ مخرج حلق ہے یہ' پڑھ لیا' گاڑیوں کے وقت دیکھ لئے' نوٹ کر لیا سب کچھ کر لیا۔ الٰہی عاقبت محمود گرداں' ٹھپ دیا ٹائم ٹیبل رکھ دیا' اور اس کے بعد اٹھ کے دفتر چلے گئے۔ پڑھتے رہئے روز اس ٹائم ٹیبل کو' تو پہنچ جائیں گے راولپنڈی آپ؟ یہ ٹھیک ہے کہ اب تو ہم پہنچتے بھی نہیں ہیں راولپنڈی جب اس کے قریب جاتے ہیں تو کہتے ہیں (1 راولپنڈی آ گیا ہے یعنی اوہ وی تہاڈی ول آ ؤندا ہیگا' گل ٹھیک ہیگی کہ پنڈی نہیں جاندے اووی آ ؤندا ہیگا' اجے لاہور نہیں آیا' ٹھیک بات ہے ایہ تہاڈے ول آ ؤنا چاہیدا ے۔ اوملاں کھواچ ڈگ پیا سی ناں' اوہنوں کڈھن واسطے بندا گیا تے اوہنوں کہن لگا اومولوی صاحب آ ہتھ دیو مینوں' ہتھ دیو' ہتھ دیو تے اوہتھ ای نہ دیوے' اوہ اتوں کہن لگا اوئے اینوں تے تیرا پتہ ای نہیں ایس گل دا اینوں کہو مولوی آ ہتھ لو میرا' اوہنوں کہیا جی ہتھ لو او ہنے ہتھ پھڑ لیا۔ کہن لگا ایہنے اوہ گل تے سنی ای نہیں کدی ساری عمر کہ دیو' اینوں کہو لو' اسیں وی کدی راولپنڈی جاندے نہیں آ راولپنڈی آ ؤنی ہیگی اے۔) ہاں جی۔ روز صبح اٹھ کے وہ ٹائم ٹیبل Consult کیا کرو' اس کو کہا کرتے رہا کرو (**ذٰلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**) (5/54) جی' یہ بھی ضروری ہے کہ جب وہ Consult کرنے لگو نا تو وہ کہا بچوں کو کہ چلو چلو پرے ہٹ جاؤ دور ہو جاؤ ذرا بڑا اہم معاملہ ہیگا' راولپنڈی جان دا مسئلہ اہم' میں ایس ویلے وہ Consult کر رہا ہوں ٹائم ٹیبل کو' ہاں سب سے کہہ دو۔ ہاں یہ ہے نا شیطان رجیم سے پناہ مانگ رہے آپ' کوئی مخل نہ ہو اس وقت۔ بڑے غور سے پڑھنا ہے اگر دو چار منٹ کا بھی ادھر ادھر کا ہو گیا تو گاڑی Miss ہو جائے گی ٹھیک ہے' یہ سب کچھ کرنے کے بعد اسے پھر لپیٹ کے رکھا پھر دفتر چلے گئے' (**فاستعذ باللہ**) اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ پھر سوچا یہ ہے کہ یہ تو روز کچھ کرنا پڑتا ہے یہ بنتا بھی کچھ نہیں' کیا کیا جائے' تعویذ لکھ کر ڈال لیا' تعویذ کا لفظ اسی سے ہی ہے' یہ اعوذ جو ہے نا اسی سے یہ لفظ تعویذ ہے' اس کے معنی ہے مستقل طور پہ ایک چیز کا ہو جانا' کہا ٹھیک ہے روز روز اٹھ کے اعوذ باللہ من شیطان الرجیم وہ ایک ہی تعویذ لکھ کے ڈال لیجئے چلو ٹھیک ہے جناب' عرب یہ لفظ بولا کرتے تھے آپ نے دیکھا ہے کہ یہ مرغی اپنے چھوٹے چھوٹے چوزوں کو باہر لے جاتی ہے ان کو سکھاتی ہے دانہ دنکا کیسے چگنا ہے' باہر کھیت میں کیسے پھرنا ہے یہ سارا کچھ ہوتا ہے' بڑے اطمینان سے وہ چوزے یہ کچھ کرتے ہیں' جونہی کہیں چیل کا سایہ ان پہ پڑے یا بلی کی میاؤں یہ سنیں آپ دیکھتے ہیں کہ وہ یکلخت بھاگ کے مرغی کے پروں کے نیچے آ جاتے ہیں' اس کی حفاظت میں آ جاتے ہیں اسے عزیزان من عرب اعوذ کہتے ہیں۔ آج کی اصطلاح میں جسے Umbrella کہا جاتا ہے' یہ چھتری کے معنوں میں نہیں وہ آتا' بڑی Protection جو ہوتی ہے کسی کی' کہا کہ جب یہ چیز تم قرآن کے اوپر عمل کرنے کے لئے اٹھو انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر تو پہلی چیز یہ

ہے کہ یہ جو جذبات آنے والے ہیں تمہارے ان سے Protection کا سامان جو ہے حفاظت کا سامان جو ہے تعوذ کا سامان جو ہے یہ پہلے کرو' یہ جو کششیں اور جاذبیتیں ہیں جن کو قرآن نے کہا کہ ٹھیک ہے مال و دولت زن و فرزند یہ **زینة من الحیوٰة الدنیا** دنیا ہیں' بڑی وجہ کشش چیز ہیں' ضرور ہونی چاہئے لیکن جب اقدار کے اندر ٹکراؤ آ کے پڑے تو کہا یہی وہ فرزند اور مال و دولت تمہارے لئے فتنہ بن جاتے ہیں' کٹھالی بن جاتے ہیں جس میں سے گزرنا ہوتا ہے تمہیں' اور اگر اس میں سے تم حفاظت کا سامان نہ کرو تو وہ کہا (**عدو لکم**) یہی تمہارے دشمن ہو جاتے ہیں' حفاظت کا سامان اپنے ہی جذبات سے عزیزانِ من' حفاظت کا سامان' لیکن شیطان یا ابلیس اکیلا ہی تو نہیں کہا قرآن نے' وہ تو جنود بھی کہا ہے' لشکر اس کا' (1 اوکلّے دوکلّے دا تا فیروی کوئی مقابلہ) لشکر اس کا ہجوم کر کے آنے والا' یہ وہ اجتماعی اور اقوامی ابالیس ہیں' قوم کا مفاد دوسری قوم سے ٹکرا رہا ہے' پوری کی پوری ایک قوم جمیعت سے' ہجوم بن کے لشکروں کی طرح دوسری قوم کے اوپر آ رہا ہے۔ یہ ابلیس کے لشکر جب بنتے ہیں وہ کیا کیا حربے استعمال کرتے ہیں' یہ جو آج کی اصطلاح میں Under Developed قومیں جن کو ہم کہتے ہیں وہ جن کی پرورش کے لئے Aid دینے کے لئے بہت آگے بڑھتے ہیں' ہمدردیوں کے ہزار جذبات دل میں پنہاں کئے ہوئے چلے آتے ہیں' یہ جو ضعیف قومیں ہیں' زیردست قومیں ہیں' کمزور قومیں ہیں ان کے مقابلے میں یا جن قوموں کے مقابلے میں بھی وہ یورش کرتے ہیں' کیا کیا طریق اختیار کرتے ہیں۔

قصہ ابلیس و آدم کی حقیقت

عزیزانِ من قرآن ہے! قصہ آدم جو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے' بنیاد ہے عزیزانِ من وہ بات سمجھ میں آ جائے' دین کی لم اور غایت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ جو آویزشِ ابلیس و آدم نہایت ڈرامائی انداز میں قرآن نے سمجھانے کی خاطر ایک یہ انداز اختیار کیا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بسیط حقیقتوں کو تمثیلی انداز میں ہی سمجھایا جاتا ہے اور تمثیلی انداز میں بھی جب وہ ڈرامائی انداز اختیار کر لے تو بڑا موثر ہوتا ہے وہ' بات پہلے سے تو شروع نہیں کی جا سکتی وہ تو کئی دفعہ آپ کے سامنے آ چکی ہے میں وہاں آتا ہوں جہاں ابلیس سے یہ کہا گیا ہے کہ تو اپنی لغزش کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہیں ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں تو مجبور ہوں جو کچھ کرایا خدا نے کرایا ہے' تو جو شخص ذمہ داری نہیں لیتا ان چیزوں کی اس کی اصلاح قیامت تک نہیں ہو سکتی۔ اسے کہا کہ جاؤ تمہاری اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اور وہاں بڑے خوبصورت ہیں عزیزانِ من یہ ڈائیلاگ جو ہیں (**قال ارءیتک ھٰذا الذی کرمت علی لئن اخترن الیٰ یوم القیٰمة لاحتنکن ذریته الا قلیلًا**) (17/62) کہا کہ یہ ہیولیٰ آب و گل' مٹی دا مادھو شے کیا ہے' چھوڑ دو اسے اور مجھے اب میدان میں' اور ایک دنگل آوے۔ شرط ایک ہی ہے کہ یہ نہ کہیں ہو کہ جب میں اس پہ چڑھ دوڑوں اور میں غلبہ پالوں تو موت تیرے ہاتھ میں ہے اس وقت میرا ٹینٹوا دبا دے اور پھر تو موت مجھے دیدے تو یہ پھر مقابلہ برابر کا تو نہ رہا۔ کہا یہ ٹھیک ہے کہ ایک فرد جو ہے' آدم کی اسے تو موت آئے گی' ذریت جو ہے' نسل آدم جو چلی آ رہی ہے جب تو اسے زندہ رکھے گا تو پھر مجھے بھی زندہ رکھنا ہوگا' کہا ٹھیک ہے ہم بڑے منصف مزاج ہیں' مانی شرط' کہا مانی' سرکار جان کی امان پاؤں تو عرض کروں ہزار ہزار سلام کے ساتھ اور اس نے واقعی عرض ہزار ہزار سلام کے ساتھ کہا تھا۔ (**قال فبعزتک**) (38/82)

تیری عزت کی تو اب دیکھ تماشا دیکھ جب تو نے کہہ دیا کہ تجھے چھٹی ہے قیامت تک اب تماشا دیکھ (**لاحتنکن ذریته الا قلیلًا**) یہ لفظ جو ہے عزیزان کئی دفعہ بتا چکا ہوں عجیب وغریب لفظ ہے۔ گھوڑے پہ تو سواری کی جاتی ہے زین اور لگام اور یہ چیزیں اور زیب دیتی ہیں اس کو وہ تو اور زیادہ حسین ہو جاتا ہے اس میک اپ سے لیکن وہ گاؤں کے لڑکے جب ان کے قابو کوئی ٹیر آ جاتی ہے یا ٹٹو آ جاتا ہے' ان کے پاس کہاں یہ زین اور کہاں ان کے پاس یہ لگامیں' تو وہ ایک رسی لے کے تے رسی وی ہووے منج دی وہ اس کی تھوتھنی کے اوپر اس کو بل دیتے ہیں (1 کبھی اینوں کہندے نیں' تے اے پاؤندے نیں اوہنوں' اے پا کے تے ایہدے اتے چڑھدے نیں)' اب سوچئے بغیر زین کے اس کے اوپر یہ سوار لونڈا' ایڑیاں مار رہا ہے اور وہ منج کی رسی کے ساتھ وہ کبھی دتی ہوئی اونوں' اس میں یہ اس کے لئے تکلیف کا پہلو نہیں ہوتا ذلت کا پہلو بھی بڑا ہوتا ہے' اس گھوڑے کے مقابلے میں کہ جس کی کیفیت یہ ہو کہ اس قسم کی وہ لگامیں ہیں اور زین ہے اور کھڑا ہوتا ہے تو دو سائس اتر کے اس کی لگاموں کو سامنے سے پکڑتے ہیں' اس میں بڑی عزت ہوتی ہے۔ سواری تو اس پہ بھی ہوتی ہے' یہ وہ ہوتے ہیں گھوڑے جو مقربین بارگاہ سلطانیہ ہوتے ہیں' لیکن یہ کیفیت جب ہو کہ وہ (1 ٹٹو پہ لونڈا سوار ہو اور کبھی پائی ہوئی اوہنوں) اسے وہ مار مار کے بھگا رہا ہے کیا ایک لفظ کہ اب تو نے مجھے دی ہے نا چھٹی اور اب تیری عزت کی قسم تماشا دیکھ کہ میں اے ٹٹو تے کبھی پا کے اینوں نچاؤندا نہیں او تھے' اور اجتماعی طور پہ کیا کروں گا میں' سنیے عزیزان من! ہاں' اس کا جواب تو ادھر سے ملا تھا (**قال اذهب**) ٹھیک ہے جاؤ' مقابلہ ہے اور جو حربہ بھی تو استعمال کرنا چاہتا ہے کر' ہم تو نہیں کہیں تمہیں روکیں گے۔ آگے یہ کہا ہے (**فمن تبعک منهم**) میں ابھی عرض کروں گا جو یہ کہا ہے کہ یہ کس کے ساتھ ہو سکے گا اور کس پہ نہیں ہو سکے گا وہاں اعوذ باللہ آئے گا' کہا اجتماعی طور پہ سنئے کہ کیا کیفیت ہوگی (**واستفزز من استطعت منهم بصوتک و اجلب علیهم بخیلک و رجلک و شارکهم فی الاموال و الاولاد و عدهم**).

جنودِ ابلیس

کیا چیز ہوگی' ٹھیک ہے' کیا حربے استعمال کرے گا' پہلی چیز Psychological حربہ' پروپیگنڈے۔ میں کچھ نہیں کروں گا ان کے ہاں جاؤں گا بھی نہیں' کچھ آوازیں فضا کے اندر منتشر کروں گا۔ یا اللہ' قرآن ہے عزیزان من۔ یعنی آج ان اقوام کو لشکر دوڑانے کی ضرورت ہی نہیں رہی' وہ تو آگے کہا ہے کہ جہاں ضرورت اس کے بعد جہاں ہموار کر دوں گا فضا کو جب اس طرح سے پھر بھیج دوں گا میں' سوار بھی پیادے بھی' پہلی چیز تو یہ ہے' صوت کے ذریعے سے' یہ آلات ابلاغ جسے آپ کہتے ہیں آپ ذرائع جن کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے یہ آپ کے ہاں کے ریڈیو' یہ آپ کے ہاں کے ٹی وی' یہ ٹرانسسٹر صاحب گاؤں گاؤں قریے قریے ہل چلانے والا دہقان بھی وہ ہل کی کھٹی کے ساتھ ٹرانسسٹر باندھا ہوتا ہے گدھے والے نے اوپر بیٹھا ہے ساتھ اس کے ٹرانسسٹر رکھا ہے۔ اندازہ لگائیے (**صوتک**) یہ ابلیس کے جنود جو تھے یہ وہی کچھ کر سکتے ہیں نا وہ اکیلا کہاں کہاں یہ کچھ کرے گا' وہ تو وہاں ایک وہ ایک بہت بڑا محیط الصوت جو ہے اس کو لے کے بیٹھا ہے اور وہ ریڈیو سٹیشن کو' اور یہ سارے اس کے جنود جو ہیں یہ لئے پھر رہے ہیں۔

ابلیس کے مختلف حربے

پہلی چیز تو یہ عزیزان من اس دور کے اندر سب سے زیادہ کامیاب حربہ پروپیگنڈے کا حربہ ہے' نفسیاتی تغیر ہے نا جس پہ بنیاد ہوتی ہے یہ سارے خارجی انقلاب کی۔ وہ نفسیاتی تغیر میں تو خیالات کو بدلنا ہوتا ہے تصورات کو بدلنا ہوتا ہے اور وہ اس پراپیگنڈے کے ذریعے بدلا جاتا ہے۔ وہ گوئبلز کے الفاظ میں کہ جھوٹ کو اس تواتر سے متواتر ڈھیٹ ہو کے دہراتے چلے جاؤ کہ پھر وہ ایک دن سچ بن کر نظر آنے لگ جائے۔ کہا پہلی چیز یہ ہے کہ یہ کروں گا' پھر اس کے بعد جب یہ تیار ہو جائے گی یہ زمین اس طرح سے تو پھر لشکر کشی بھی ہو گی' رسالے بھی دوڑائے جائیں گے انفنٹری بھی آئے گی' پیادہ لشکر بھی ہوں گے ہر قسم کی لشکر کشی اس کے اندر آ جاتی ہے خواہ آج کے وہ ٹینک اور ہوائی جہاز اور یہ چیزیں کیوں نہ ہوں' اس کے بعد یہ بھی ہوگا۔ کہا پھر ایک اور موثر حربہ ہے اور وہ یہ ہے کہ Financially, Economically پلاننگ ایسی کروں گا اقتصادی اور معاشی پلاننگ' الفاظ ہیں (**شار کھم فی الاموال**) یوں نہیں پہلے دور کی طرح کہ ان کا مال لوٹ کھسوٹ کے اپنے ہاں یوں لے جاؤں گا جو محسوس ہونے لگ جائے' وہ جو اس سے پہلے پالیسی تھی ان کی Colonization کی کہ Under Developed Countries کے اندر آؤ اور یہاں کا سارا مال و دولت جو ہے لوٹ کھسوٹ کر اپنے ملک بھیجتے چلے جاؤ۔ وہ چیزیں جو تھیں وہ بے نقاب ہونی شروع ہو گئیں۔ یہ قومیں ذرا ہوشیار ہوئیں انہوں نے کہا غلط ہے' یہ یونہی نہیں انگریز چھوڑ گیا ہے آپ کا ہندوستان۔ اس نے کہا کہ طریقہ بدلو اس سے' Economic کا پلاننگ ایسا کیا گیا کہ وہاں کی ایڈ یہاں آ کے شامل کی گئی الفاظ ہے (**شار کھم فی الاموال**) ان کے مال و دولت میں جا کر شرکت کرو' یہاں سے کھسوٹ کے نہ لے جاؤ اب یہ پہچان جائیں گے' نہ شرکت کرو اس کے اندر۔ یہ سوائے Big دو چار Empires کے عزیزان من ساری دنیا کی کمزور قومیں یہ جو فنانشل ایڈ ہے اس کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں' الجھی ہوئی ہیں اس وقت' ساری آزادیاں ان کی سلب ہو چکی ہوئیں ہیں۔ (**شار کھم فی الاموال**) کہا پھر اور کیا کروں' کہا یہ تو وہ ہوگی جو موجودہ نسل ان کی ہوگی' ان کو تو اس طرح سے پھانسوں گا اور آگے' کہنے لگے' آگے ہے وہ جو مسلسل چیز جس کو میں نے کہا تھا کہ اس کی ذریت کے ساتھ میں یہ کیا کروں گا۔ کروں گا (**والاولاد**) یہ آنے والی نسل جو ہے ان کے تخیلات' نظریات اور تصورات جو ہیں اس میں بھی میں شرکت کروں گا۔ سارے ابلیسی تصورات جو ہیں ساتھ کے ساتھ یہ کرتا چلا جاؤں گا' شریک ہونگا' یہ نہیں کہوں گا ان کو کہ تم غیر مسلم ہو جاؤ۔ کافر بن جاؤ۔ بالکل نہیں۔ کمیونسٹ بھی یہ نہیں کہتا کہ تم کافر بن جاؤ۔ وہ کہتا ہے مسلمان رہ سکتے ہو تم تمہیں نماز روزے کی سب اجازت ہے صرف جو آئیڈیالوجی ہے۔ وہ ہے جو ہم دیتے ہیں۔ تم اپنے ساتھ رکھو اللہ کو (**شار کھم**) ابھی اگلی آیت میں دیکھو ابھی آتا ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ شرک جو ہے اس کے ذریعے سے مارتا ہے تمہیں یہ۔ عزیزان من! یہ آپ کے ہاں کے جو ابالیس یہاں ہیں اگر کھلے بندوں یہ کہیں کہ ہم خدا کے منکر ہیں' بے دین ہیں' کافر ہیں مسلمان نہیں ہیں' ان کے بھرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ لہٰذا وہ سب مسلمانوں کا سا نام رکھا کے مسلمان بن کے آپ کے ہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسلامی انجمنیں' اسلامی جلسے' اسلامی کانفرنسیں ہوتی ہیں ان میں آتے ہیں' ان کی صدارتیں کرتے ہیں۔ (**شـــار کھـم**) اوئے الگ بیٹھ کے ان سے ہٹ کے نہیں کوئی نہیں مانے گا۔

(**شارکھم فی الاولاد**) اندر گھس کے ان کے' ساتھ رہ کے ان کے' شریک ہو کے ان کا۔ عزیزانِ من آیت تو ایک ایسی تھی کہ اس کہ اوپر ہی کئی دن میں آپ کو درس دیتا رہتا' کیا کروں میں نے تو وہ وقت بھی لے لیا جو درمیان میں کھا گیا تھا۔ لیکن عزیزان من! یہ باتیں بھی ختم ہوسکتی ہیں صاحب؟ مجھے چلنا چاہئے آگے۔ یہ جو ہے آیت اس کو ختم کرنا چاہئے دس منٹ کی مزید اجازت لوں گا ضرور بات بیچ میں نہ رہ جائے۔ کہا پھر کیا کروں گا' ان کو کچھ اسی وقت نقدی دے دوں گا کہ نہیں صاحب ٹھیک ہے یہ تمہارا اتنا سا ملک ہے وہ چھن گیا ہے لیجیے میرے ہاں آجایئے امریکا بہت بڑا ملک ہمارا ہے' اس میں آجایئے میں یہ کروں گا وغیرہ وغیرہ(**و عدھم**) وعدے کرتا چلا جائے گا' اور ایسا بھی تمہارے ہاں کسی نے تمہارے حق خودارادیت کے خلاف ذرا سا قدم بڑھایا اور تم دیکھو ہماری مدد کس طرح سے تمہیں آئے گی' چڑھ جا بچہ سولی رام بھلی کرے گا۔ (**وعدھم**) وعدے کرتے ہیں' وعدے کرتے ہیں اور یہیں کہا ساتھ ہی (**وما یعدھم الشیطٰن ال غرورًا**) کہا یہ وعدے سارے روز ہوں گے' بہت ایماندار ہیں۔

سائیکالوجی کا پھندا اور سوشیالوجی کا پھندا

عزیزان من! آج کے دور کا نوجوان جسے سائیکالوجی یوں پڑھائی جاتی ہے کہ یہ چیزیں جو آتی ہیں کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ ان کا مقابلہ کر سکے' میں اگر یہ عرض کروں کہ سائیکالوجی کے یہ مختلف جو Departments ہیں Behaviourism, Instinctism یہ Anthropology سوشیالوجی' پولیٹکل سائنس یہ جتنی چیزیں بھی ہیں' یہ سب کی سب یہ بتا رہی ہیں کہ انسان یہ Instinctism والا تو وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ پیدا ہونے سے پیشتر ہی یہ ساری چیزیں جتنی بھی ہیں ابلیس ہی اپنے اندر لے کے پیدا ہوتا ہے' پیدا ہی ہوتا ہے۔ دوسرے Anthropology والے وہ کہتے ہیں کہ یہ وراثتاً آتی ہیں اوپر' Behaviourism والا کہتا ہے معاشرے میں جس قسم کی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں عادتیں ڈالی جاتی ہیں وہ ہو جاتی ہیں۔ یہ سوشیالوجی والا یہ کہتا ہے کہ ابتدائی تربیت بچے کی جس قسم کی اور تعلیم آپ کر دیتے ہیں ساری عمر وہ ویسا ہی رہتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اس نتیجے پہ پہنچاتا ہے کہ پھر اس کا بدلنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ یعنی ہر نوجوان ہمارا جو سائیکالوجی کے آج پھندے میں آتا ہے ہر نوجوان جو ہے وہ ابلیس بن جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ میں جرائم آپ کر ہی نہیں رہا میرے بس کی بات ہی نہیں ہے صاحب' یہ روز آپ جو یہ مباحثے دیکھتے ہیں کبھی ٹی وی پہ کبھی سنا کیجئے نوجوان' میں وہ صرف وہ دیکھ لیتا ہوں جس میں نوجوان آتے ہیں ان کا سوال ہی یہ ہوتا ہے بڑوں سے کہ صاحب ہمیں آپ مجرم کیسے قرار دے رہے ہیں' ہمیں تو آپ نے جو بنایا ہم بن چکے ہیں' اور جو بن چکے ہیں سائیکالوجی کہتی ہے کہ اس کا بدلنا ہمارے بس میں تو ہے نہیں۔ تو یہ بات آ گئی نا پھر' بنا دیا نا ایک ایک کو ابلیس اب بس کی بات ہی نہیں ہے۔ مطمئن ہو گیا اب ضرورت ہی نہیں ان سے کسی قسم کے وعظ و نصیحت کی' جب وہ طے کر لے کہ میرے بس کی بات ہی نہیں ہے اصلاح ہی نہیں ہوسکتی تو پھر تو اس کی اصلاح کا امکان ہی نہیں۔ ابلیس تو کبھی بھی اصلاح یافتہ نہیں ہوسکتا۔ نوجوانوں کو یہاں پہنچایا دیا۔ فرسٹریشن۔ لفظ ابلیس کے معنے بھی تو ناامید شدہ ہیں' مایوس ہونے والا ہے۔ اپنی اصلاح کی طرف سے ہمارا نوجوان مایوس ہو چکا ہے۔ Completely Frustrated کہ نہیں صاحب کسی کے بس کی بات ہی نہیں ہے

اب، ہمارے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ یہ ہے نا وہ چیز اور یہاں ہے اس کا توڑ جب یہی بات ہے تو پھر (فاستعذ) کیا معنیٰ، یعنی پھر وہ پناہ کہاں ڈھونڈے، وہ مرغی ہے نہیں جس کے پروں کے نیچے آ جائے، وہ Umbrella ہی نہیں ہے، اس نے انکار ہی کر دیا ان کے وجود کا۔ ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر (**فاستعذ**) کیا۔

مایوسی کا علاج

اور یہ ہے وہ مقام عزیزان من! جہاں قرآن کریم چودہ سو سال پیشتر جتنے بھی سائیکالوجسٹ ہیں ان تمام کے وہ مسلمات جنہیں یہ لاعلاج کہہ کے پیش کر رہے ہیں ان تمام مسلمات کی تردید کرتا ہے وہ، کہتا ہے غلط بات۔ ہم نے آدم کے اندر ایک اتنی بڑی قوت رکھی ہے کہ اگر اس کی یہ قوت بیدار ہو گئی اور اس نے اس سے کام لینا شروع کر دیا، تیرے ایک ایک حربے کو توڑ کے رکھ دے گا۔ (**ان عبادی لیس لک علیھم سلطٰن**) جو میرے قوانین کی عبودیت اختیار کریں گے ان پہ تیرا کسی قسم کا کوئی غلبہ نہیں ہو سکتا، اور آپ حیران ہوں گے عزیزان من! کہ پہلے زمانے میں تو یہ نظریات کہیں جا کے صدیوں میں بدلا کرتے تھے زمانہ بڑا تیز ہو گیا ہے، کل ابھی سائیکالوجی چلی ہے اسے بطور ایک، سائنس تو ابھی یہ بنی نہیں تھی، بہرحال ایک علم کی بنا پر ولیم جیمز نے ہی تو پیش کیا ہے کل کی بات ہے ابھی، پچاس ساٹھ برس ہوئے ہیں، اس دوران میں یہ سارے نظریے جتنے تھے یہ عام ہوئے، مسلمات کے طور پہ مانے گئے۔ یہ سابقہ حقائق ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ آج اس دور میں ابھی انہیں ملکوں سے The Most Eminent Pschycologists بڑے ہی بلند پایہ سائیکالوجسٹ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ یہ سارے مسلمات غلط ہیں۔ انسان بَلا واقع ہوا ہے اس کے عزم کے سامنے ان میں سے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ ان کے ہاں کی Latest کتاب اتفاق سے آج کل میرے زیر مطالعہ ہے، بڑی عجیب و غریب ہے۔ وہ ایرک فرام کا میں اکثر استعمال کیا کرتا ہوں بہت بڑا Psycho Analysist ہے امریکا کا اس وقت کا۔ Latest کتاب اس نے یہ لکھی ہے۔ خود سائیکالوجی کے پلیٹ فارم سے کھڑا ہو کے وہ بول رہا ہے اور کہتا ہے یہ سارے نظریے غلط ہیں، فرسٹریشن کا کوئی مقام انسان کے لئے نہیں ہے۔ فرسٹریشن یہ ہے کہ یہ اپنے اندر کی اس قوت کو بھلا دیتا ہے۔ قرآن نے بھی آدم کے متعلق یہ کہا تھا (**فنسی**) یہ بھول گیا اپنے آپ کو تو پھر ہم نے دیکھا کہ اس میں عزم نہیں رہا۔ شیطان غالب اس پہ آ گیا ہے، نتیجہ ہے، قرآن نے یہ کہا ہے (**ان عبادی لیس لک علیھم سلطٰن**) اور یہ ہے جہاں سائیکالوجی آج پہنچی ہے اور یہی اس آیت کے اندر ہے (**فاستعذ باللہ من الشیطٰن الرجیم انہ لیس لہ سلطٰن علی الذین اٰمنوا و علی ربھم یتوکلون**) اس کا کوئی جادو، اور تیرا کوئی غلبہ نہیں ہو سکے گا ان لوگوں کے اوپر جو ہماری ان اقدار کی صداقتوں پر ایمان رکھیں گے، اور پھر یقین رکھیں کہ یہ کبھی دھوکا نہیں دیں گی۔ یہ سہارا ٹوٹے گا نہیں۔ ان پہ تیرا کوئی غلبہ نہیں ہو گا۔ (**انما سلطٰنہ**).

سورۃ النحل کی آیت 99 تک ہم آ گئے ہیں، 100 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

(**ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم**)

★★★★★★★★★★★★★★★